تذکرۂ جگر

محمود علی خاں، جامعی

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

تذکرہ

جگر مرادآبادی

تذکرۂ جگرؔ

از

محمود علی خاں جامعی

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

کتابت :-

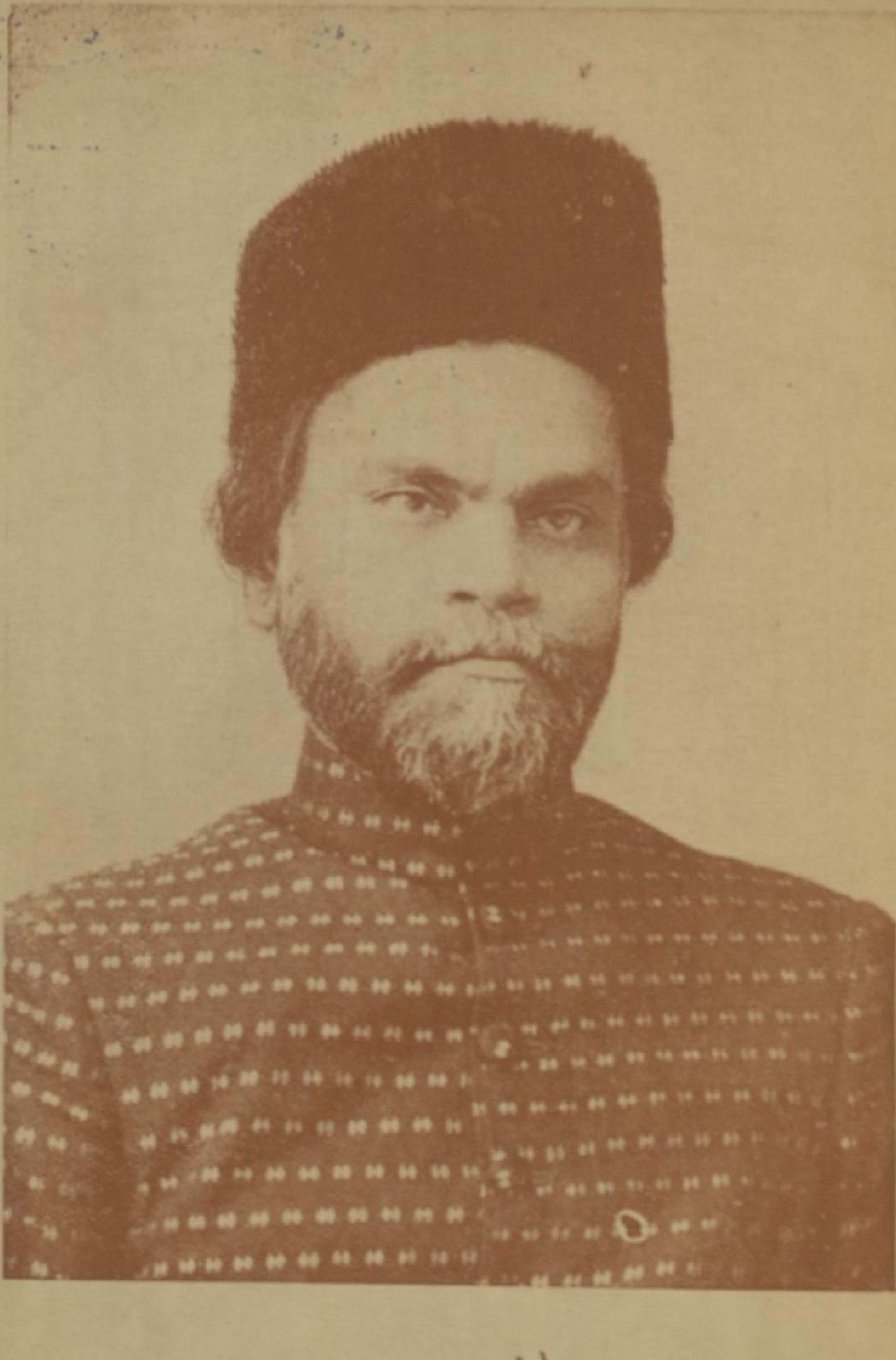
شفاعت احمد چغتائی

طباعت :- ایجوکیشنل پریس، کراچی،

قیمت :- چار روپے ۲۵ پیسے

بار اول :- اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

اُردو مرکز
پنجاب آفس
گنپت روڈ — لاہور



[illegible]

تذکرۂ جگر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

وہی لطافت وہی نزاکت وہی تبسّم وہی ترنّم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا ہوں وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

حرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مست ہیں ان دونوں جہانوں میں جن کے فیض سے ہیں
دیکھتا ہوں

کانوں میں میرے آج یہی [illegible] ہیں

سب ان پہ تن تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزو ہیں آنکھوں کی التجائیں

اب نکالیں گھر وہ [illegible] آئے ہیں
از عمر [illegible] ہیں

پیش لفظ

یہ کتاب جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی۔ ان کے شعری مطالعہ اور ان کے انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔ اس کے لکھنے کا مقصد ریسرچ کے طالبِ علم کے لئے کوئی مواد فراہم کرنا یا جگر کی شاعری پر گہری تنقیدی نظر ڈال کر شاعری میں ان کا صحیح مقام مقرر کرنا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے مذکورۂ بالا ہر دو مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی ہے لیکن ہمارا مقصد محض ایک "ادبی شغل" ہے یا ایک دوست کی جانب سے ایک دیرینہ دوست کی خدمت میں "نذرِ خلوص و محبّت"۔

اس کتاب کا شانِ نزول یہ ہے کہ جگر صاحب اکثر موقعوں پر فرمایا کرتے تھے "محمود۔ میرے بہت سے احباب مجھ سے بہت قریب ہیں لیکن اتفاق سے وہ لکھنے کی مشق نہیں رکھتے۔ بخلاف اس کے بہت سے اہلِ قلم حضرات سے بھی میرے تعلّقات ہیں لیکن ان میں بیشتر کو زیادہ قریب سے میرا مطالعہ کرنے کا اتّفاق نہیں ہوا ہے۔ البتہ تم ان چند احباب میں سے ہو جن میں یہ دونوں صفات موجود ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے

متعلق کچھ لکھو۔" میں ان سے "انشاءاللہ۔ ضرور لکھوں گا۔" کہہ دیا کرتا اور بات ختم ہو جاتی۔ اب جب کہ میری صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ چل چلاؤ کا زمانہ آ لگا ہے۔ میں چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو کر گھر کی چہار دیواری میں نظر بند ہو گیا ہوں۔ خالی پڑے پڑے دل بھی گھبراتا ہے اور طبیعت کوئی مناسب مصروفیت کی تلاش میں رہتی ہے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ جگر صاحب کی وہ خواہش پوری کر دی جائے۔ اس طرح بہت سی وہ باتیں بھی محفوظ ہو جائیں گی جن کا بعد میں معلوم ہونا مشکل ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے یہ چند صفحات لکھنا شروع کر دیئے مگر اب حالت یہ ہے کہ ایک صفحہ لکھنے کے بعد پندرہ منٹ دم لینے کے لئے رُکنا پڑتا ہے۔ بہرحال اللہ کے بھروسے پر کوشش شروع کر دی گئی۔

جگر کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دورِ جدید کے شعراء میں سے اقبال کے سوا کسی اور شاعر کے متعلق اس کی زندگی میں اتنا زیادہ نہیں لکھا گیا جتنا جگر کے متعلق لکھا گیا ہے لیکن اس میں سے بیشتر حصہ "شاعری میں ان کے مقام" کے متعلق تھا۔ کم حضرات نے ان کی نجی زندگی پر نظر ڈالی ہے حالانکہ ان کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان کی نجی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ خود جگر کا قول ہے کہ "شاعر کی زندگی سے اُس کی شاعری مختلف نہ ہونا چاہیئے جتنا اس کی زندگی سے اس کی شاعری الگ

ہو گی۔ اتنا ہی وہ صداقت سے دُور ہو جائے گی۔"

جگر کی نجی زندگی کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے صرف چار حضرات نے ایک نظر ڈالی ہے۔ اس میں سب سے کامیاب پروفیسر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی کی کوششیں ہیں اور اس کے بعد طفیل احمد صاحب اڈیٹر نقوش اور مالک رام صاحب مقیم ملجیم کی تحریریں اور مقالات ہیں۔ رہی جگر کی ادبی حیثیت اور شعری مقام تو اس موضوع پر بیسیوں مقالات لکھے جا چکے ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں کوئی مزید کوشش کرنا تحصیل لاحاصل کے برابر ہے۔ علاوہ بریں اس مقصد کے لیۓ ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے جس کے لکھنے کی ہمت موجودہ صحت کی حالت میں میں اپنے میں نہیں پاتا ہوں۔

جگر کے کلام پر تنقید کرنے یا شاعری میں ان کا مقام مقرر کرنے کے لیۓ یہ ضروری ہے کہ کم از کم غالب کے زمانے سے اُردو شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے کہ اس وقت اُردو شاعری کا کیا رنگ تھا اور کس طرح غالب کی شاعری اس پر اثر انداز ہوئی۔ پھر حالی کی اصلاحی تحریک نے شاعری میں خیال اور زبان پر کیا اثر ڈالا۔ اس کے بعد جدید دَور کے شعرا اقبال۔ حسرت اور فانی نے کیا جدتیں پیدا کیں اور کس طرح قدما کے بعض محاسن کی پیروی کر کے اسے اپنایا اردو شاعری پر عام طور پر ایک افسردگی اور اضمحلال طاری ہو گیا تھا کس طرح اصغر نے اس کا نہج بدل کر اس میں سرخوشی کی رُوح پھونکی۔ پھر کس طرح جگر

نے نشاط کی جانب ایک اور قدم بڑھایا اور بعض روایات کہن کو خیرباد کہہ کر ان کے بجائے حیات بخش نظریات کو اپنی شاعری کا جزو بنایا۔ اس طرح کہ شاعری کی گرتی ہوئی ساکھ سنبھل گئی اور ہماری شاعری بھی اپنے زمانہ سے ہم آہنگ ہو کر آگے قدم بڑھانے لگی۔ اس میں نئے سرے سے مقبولیت خاص و عام کی جان پڑ گئی۔

مگر یہ سب کچھ کرنے کی نہ ہمت ہے، نہ موقع۔ البتہ آخر میں جگرؔ کے کلام پر مختصر سا تبصرہ شامل کر دیا ہے تاکہ قارئین کرام کو جگر صاحب کے کلام کے متعلق کچھ نہ کچھ رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ ویسے اس کتاب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جگر صاحب کی نجی زندگی اور کردار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے جن سے ان کے کلام کی نوعیت یا خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے یا اسے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ چند سطور محض اس لئے لکھ دیں کہ قارئین کو عام طور سے اور تنقید نگار حضرات کو خاص طور سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

محمود علی خاں جامعی

۲۱۱- پیر کالونی۔ کراچی

۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء



کھڑے ہوئے : محمود علی خاں (مؤلف)
بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں : جگرمرادآبادی ، فانی بدایونی ، جوش ملیح آبادی

مکرّر

یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء

یہ کتاب مارچ اور اپریل سنہ ۱۹۶۰ء میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت جگرؔ حیات تھے۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ ان کی حیات میں یہ کتاب شائع ہو جائے لیکن افسوس کہ ایسا ممکن نہ ہو سکا اور میری اس چیخ پکار کے باوجود کہ مصنف اور ممدوح یعنی جگرؔ صاحب اور میں دونوں لبِ بام اور چراغِ سحری ہیں اس لئے اسے جلد از جلد منظرِ عام پر لے آیا جائے لیکن افسوس خدا کو یہ منظور نہ تھا اور کتاب شائع نہ ہو سکی۔

اب جب کہ جگرؔ ہم میں نہیں رہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب پر نظرِ ثانی کی جائے۔ نظرِ ثانی تو کچھ نہ کچھ کی ہے لیکن فعلِ حال کے صیغوں کو فعلِ ماضی سے نہیں بدلا ہے۔ جوں کا توں رہنے دیا کیوں کہ اگرچہ اب اس حادثہ کی صحت میں شُبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ دماغ دل کو باور کرانے کی ہزار کوشش کرتا ہے لیکن دل اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتا اور وہ مشاہدے پر مشاہدے پیش کرتا ہے کہ ؎

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ جا رہے ہیں وہ آ رہے ہیں

بہرحال دماغ اور دل میں یہ جھگڑا تو عرصے تک جاری رہے گا اور حقیقت اپنی جگہ محیط سے محیط تر ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایک دن دل کو بھی قائل ہونا پڑے گا ؎

قیدِ ہستی سے کب نجات جگرؔ	موت آئی اگر حیات گئی

اسی لئے یہ طے کیا گیا کہ اصل میں کچھ ترمیم کرنے کے بجائے آخر میں "آہ جگر" کے عنوان سے چند صفحات کا اضافہ کر دیا جائے۔

جگرؔ

کی

نجی زندگی اور کردار کا مطالعہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلی مُلاقات جگر صاحب سے میری پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ غالباً سب ہی لوگوں کی ان سے پہلی ملاقات ایسے ہی عجیب اور چونکا دینے والے انداز میں ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا سیّد سلیمان ندوی اور شوکت تھانوی کی ملاقاتیں جن کا تذکرہ مولانا نے اپنے شعلۂ طور کے پہلے اڈیشن کے دیباچہ میں اور شوکت تھانوی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ دونوں نے یکساں تاثرات بیان کئے ہیں کہ جگر جیسے کم رو، لاابالی اور خستہ حال شخص کو دیکھ کر ابتدا میں طبیعت میں ان سے فرار پیدا ہوا، پھر یہ فرار توجہ کے بعد حیرت اور پھر محبت و عقیدت میں بدل گیا۔

چنانچہ میں جب یہ کتاب شروع کرنے بیٹھا تو جی چاہا کہ اسے اپنی اس ڈرامائی پہلی مُلاقات ہی کے تذکرے سے شروع کروں۔ یہ نومبر ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ میں اس وقت فرخ آباد (یوپی) میونسپل بورڈ کا چیرمین تھا۔ اس حیثیت سے میں میونسپل بورڈ کی جانب سے سالانہ تمام اسکولوں کی ٹورنمنٹ کیا کرتا تھا جس کے آخر میں ایک مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ ۱۹۲۵ء کے اسی مشاعرے میں کانپور کے دو شعرا محمد احمد فوق اور سعید الحسن دور بغیر

اطلاع کے آکر شریک ہوئے۔ مشاعرے کے بعد ان حضرات نے مجھے اطلاع دی کہ ان کے ہمراہ جگر صاحب بھی آئے تھے لیکن شراب میں بالکل کھوئے ہوئے تھے۔ اس لئے سرائے میں ٹھیر گئے اور ہم کو یہاں بھیجدیا۔ اس وقت تک جگر صاحب کی یہ شہرت نہ ہوئی تھی جو اب ہے لیکن پھر بھی میں ان کے نام سے واقف تھا۔ اس لئے ان سے کہا کہ یہ آپنے بہت بُرا کیا۔ خیر اب صبح آپ انھیں لے کر ضرور آیئے گا۔

غرض صبح ہوئی اور میں صبح صبح ضروری انتظام دیکھتا پھر رہا تھا کہ ایک جگہ بہت کافی مجمع ہو رہا تھا اور اس مجمع میں کسی کے اشعار پڑھنے کی ایسی دلکش آواز آرہی تھی کہ میں بے تحاشا اس طرف کھنچا چلا گیا۔ جا کے دیکھا کہ وسط میں مولوی الطاف حسین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول اٹاوہ (جو کھیلوں کی اسی تقریب کی شرکت کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔) بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے ایک مخبوط الحواس سا شخص بال بکھرائے بڑے والہانہ انداز سے شعر پڑھ رہا ہے اور مجمع ہے کہ پروانہ وار اس پر نثار ہو رہا ہے۔ داد و تحسین کا غلغلہ بلند کر رہا ہے۔ جب سامنے پہنچا تو مولوی الطاف حسین نے اس شاعر کا مجھ سے تعارف کرایا کہ یہی جگر ہیں۔ اس کے بعد ہم بہت دیر تک ان کے کلام سے محظوظ ہوتے رہے۔ پھر سب لوگ تو اپنے اپنے مقام کو واپس چلے گئے لیکن جگر کو میں نے اپنے پاس روک لیا۔ جگر صاحب کوئی سات آٹھ دن میرے

پاس رہے۔ اس کے بعد وہ بھی واپس چلے گئے۔ اس کے بعد میں کئی مرتبہ مین پوری جا کر ان سے ملا۔ وہ بھی کئی مرتبہ فرخ آباد مجھ سے ملنے آئے۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات مخلصانہ حد تک بہت زیادہ بڑھ گئے۔

پیدائش جگر مراد آبادی کا نام علی سکندر ہے۔ جگر ان کا تخلص ہے لیکن یہ تخلص کچھ ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ مشکل سے دس فیصدی لوگ ان کے اصل نام سے واقف ہوں گے۔ ہر جگہ، ہر حلقہ اور ہر طبقے میں وہ جگر ہی کے نام سے معروف ہیں۔

جگر کے سنہ پیدائش کا صحیح علم نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کا یہ خیال ہو کہ ان کی حیات میں اس کی تصدیق کی جا سکتی تھی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تحصیل لاحاصل تھی، وہ خود اس معاملہ میں کوئی مدد کرنے سے معذور تھے۔ ان کی عمر کے متعلق اندازہ یہ ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال[1] ہو گی۔ لیکن اصطفا خاں صاحب کے فرمانے کے بموجب انکی پیدائش ۱۸۹۳ء ہے اس لئے عمر ۶۸ سال ہوئی جائے پیدائش بنارس، رہنے والے مراد آباد کے۔ مراد آبادی کہلاتے ہیں۔

---

[1] دورِ جدید دہلی میں گلزار دہلوی کے قلم سے جگر صاحب سے ایک حالیہ ملاقات کا تاثر شائع ہوا ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے "اب جگر صاحب کا سن بقول ان کے ستر سال ہے" مسٹر بنس لال ایم اے نے الجمعیۃ دہلی میں جگر پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جگر کی پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء کی ہے معلوم نہیں انھوں نے یہ کس ثبوت کی بنا پر لکھا ہے۔

خاندان | جگرؔ صاحب ایک قدیم ممتاز خاندان کے فرد ہیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع صاحبؒ دہلی کے رہنے والے تھے اور شاہجہاںؔ کے اُستاد تھے۔ ایک موقع پر عتاب شاہی ہوا تو ترک سکونت کر کے مرادآباد چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے پردادا حافظ محمد نور شاعر تھے اور نورؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ کے دادا مولوی محمد امجد صاحبؒ تھے اور......

...... جگرؔ صاحب کے والد مولوی علی نظر نظرؔ خواجہ وزیرؔ لکھنوی کے شاگرد اور صاحبِ دیوان تھے۔ ان کا دیوان "باغِ نور" کے نام سے شائع ہو چکا ہے گویا آپ کے بزرگ اپنے زمانے کے اہلِ علم و مرتبت ہونے کے علاوہ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جگرؔ صاحب کو یہ ذوق ورثہ میں ملا ہے۔

تعلیم | جگرؔ کی درسی تعلیم معمولی ہے۔ انگریزی تعلیم انٹرنیس تک ہے یہ تعلیم انھوں نے لکھنؤ کے جوبلی اسکول اور مشن اسکول میں حاصل کی فارسی اور اردو کی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے پائی۔ فارسی کا ان کا خاص مطالعہ ہے اور ان کا کچھ فارسی کلام بھی موجود ہے۔

جگرؔ صاحب عام طور پر کتابوں کے مطالعہ سے بہت گھبراتے ہیں۔ وہ کتابوں کو انسان کے جہل کا ایک شاہکار سمجھتے ہیں اور انھیں انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک پردہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دُنیا میں

کتابوں کا انبار جتنا بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی انسان کا جہل بڑھتا جاتا ہے۔ دراصل وہ انسان کی تعلیم کے لئے "برخویش نگاہے کن" کے قائل ہیں۔ کیونکہ انکے نزدیک انسان خود سب سے بڑی کتاب ہے۔

قیام جگرؔ صاحب کا وطن تو مراد آباد ہے لیکن بالکل ابتدائی زمانے کے علاوہ آپ وہاں رہے نہیں۔ آپ کا عموماً یہ طریقہ رہا کہ ایک مستقر رہتا تھا اور خود ملک کے مختلف شہروں میں گشت کرتے اور دو دو چار چار مہینے مختلف جگہ ٹھہرتے۔ پھر لوٹ کر اپنے مستقر پر آجاتے۔ شروع میں آپ عینک کی تجارت کرتے تھے یعنی دورہ کر کے عینکیں فروخت کیا کرتے تھے۔ آپ کو نظر ٹسٹ کرنے کا بہت اچھا ملکہ تھا۔ اس طرح شروع میں تو آپ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں گشت کرتے رہے۔ اس کے بعد شاعری کے سلسلہ میں دُور دُور بُلائے جاتے اور جہاں جاتے وہاں کئی کئی مہینے رہتے۔ اس طرح آپؒ نے ڈھاکہ اور کلکتہ۔ کراچی اور کوئٹہ۔ لاہور اور راولپنڈی۔ بمبئی اور حیدرآباد دکن بنگلور اور مدراس۔ گویا پورے ہندوستان اور پاکستان کا سفر کیا اور ہر جگہ کافی قیام کیا۔

مراد آباد کے بعد آپ کا سب سے پہلا مستقر آگرہ رہا ہے۔ یہ مستقر آپ نے پہلے معاشقہ کی بنا پر قرار دیا تھا۔ پھر محبوب کے انتقال کے بعد حضرت اصغرؔ گونڈوی سے ملاقات ہوئی اور دوسری شادی کے سلسلہ میں آپؒ کا مستقر

گونڈہ ہوا۔ بیوی سے علیحدگی کے بعد آپ اعظم گڈھ چلے آئے اور اعظم گڈھ مستقر رہا۔ اس کے بعد شیخ اصغر حسین صاحب وکیل اور چیرمین میونسپل بورڈ مین پوری سے ملاقات ہوگئی اور آپ وہیں رہنے لگے۔ اس عرصہ میں دوسرے معاشقہ کی تفریح رہی۔ پھر جناب صفی الدولہ حسام الملک نواب علی حسن خاں کے اصرار پر آپ لکھنؤ چلے آئے اور بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں قیام رہا۔ حضرت اصغر گونڈوی کے انتقال اور اپنی سابقہ بیوی سے عقد مکرر کے بعد آپ نے گونڈہ میں پھر سکونت اختیار کرلی۔ اگرچہ اپنی موجودہ علالت سے قبل وہ وہاں بھی کم ہی رہے مگر اس مرتبہ آپ کے اس مستقر میں مستقل سکونت کا رنگ زیادہ آگیا تھا یعنی متعلقین کے ہاں رہنے کے علاوہ آپ نے کافی روپیہ لگاکر گونڈہ میں مکان بھی تعمیر کرالیا تھا اور اب تو جب سے وہ بیمار ہوئے ہیں ان کی مستقل سکونت گونڈہ میں رہتی ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جگر کا وطن مراد آباد اور مستقر نہیں بلکہ سکونت گونڈہ ہے۔

مراد آباد میں جگر صاحب کا تمام خاندان ختم ہوگیا۔ نئی پود کے جو لوگ بچے وہ تتر بتر ہوگئے۔ غرض جگر صاحب کا آبائی مکان بالکل ویران ہوگیا۔ ان کے مکان کے دیوار بیچ دوسرے مکان میں ان کے کوئی عزیز رہتے تھے۔ دونوں مکانوں کے درمیان میں ایک کھڑکی تھی۔ جب جگر صاحب کا مکان بالکل خالی ہوگیا تو ان عزیز نے اسے اندر کی طرف سے بند کرکے درمیانی کھڑکی میں قفل

ڈال دیا۔ ایک دفعہ جگرؔ صاحب مراد آباد گئے تو اپنے انہی عزیز کے یہاں ٹھیرے۔ دورانِ قیام میں انھوں نے اپنے ان عزیز سے مکان کی کنجی مانگ لی۔ پھر ایک دن مکان کھول کر اندر گئے اور کھڑکی میں اپنی طرف سے کُنڈی چڑھالی۔ جب اس مکان میں گئے ہوئے جگرؔ صاحب کو زیادہ دیر ہو گئی تو ان عزیز کو فکر ہوئی۔ دیکھا تو کھڑکی دوسری طرف سے بند ہے۔ پھر تو اور فکر بڑھی۔ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو کسی ترکیب سے مکان میں داخل ہوئے دیکھا کہ جگرؔ صاحب در و دیوار سے۔ شجر و حجر سے ایک ایک سے گلے مل رہے ہیں اور زار و قطار روتے روتے اپنا بُرا حال کر لیا ہے۔ غرض وہ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انھیں وہاں سے لائے اور دوبارہ جگرؔ صاحب کو وہاں نہیں جانے دیا۔

اس کیفیت کا پورا احساس آج کل کچھ مہاجرین ہی کو ہو سکتا ہے جو اپنے بھرے پُرے گھر چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ جگرؔ صاحب تو سراپا جذبات ہیں اور احساس انتہائی تیز رکھتے ہیں۔ اتنا کہ

ع جو چھو جاتی ہوا دل درد سے لبریز ہو جاتا

شادیاں جگرؔ کی پہلی شادی معاشقہ کا نتیجہ تھی۔ آگرہ کی ایک طوائف سے[1] آپ کو عشق ہو گیا۔ یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اس سے نکاح کر لیا۔ شادی کے تقریباً دو سال بعد وہ داغِ مفارقت دے گئی۔ شعلۂ طور میں ایک نظم "ہلالِ عید" ہے

---

[1] بجنور والی وحیدن

وہ اسی حادثہ کی یادگار ہے۔ اس کے بعد اپنے محبوب کے فراق میں آپ کی حالت ابتر ہو گئی۔ نیم دیوانوں کی طرح آپ شہر شہر پھرتے تھے۔ اسی اثنا میں آپ کی ملاقات اصغر گونڈوی سے ہو گئی۔ انھوں نے آپ کو بہت سہارا دیا۔ اور آپ کی وحشت کا یہ روحانی مداوا تجویز کیا کہ حضرت عبدالغنی صاحب بنگلوری سے آپ کو بیعت کرا دیا جن سے آپ کو آج تک بیحد عقیدت ہے۔ جب آپ کی حالت ذرا سدھری تو اپنی سالی سے آپ کا عقد کر دیا۔ چند ہی روز میں ان کی آزاد مزاجی اور شراب نوشی سے آپ کی بیوی اور دوسرے اعزا عاجز آ گئے تو اصغر صاحب نے انھیں طلاق دلوا دی اور اپنی بیوی کی خواہش پر ان کو طلاق دے کر اپنی ان سالی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ یہ بیوی اصغر صاحب کے آخر وقت ان کے نکاح میں رہیں۔ اس عرصہ میں جگر صاحب برابر مجرّد رہے اور میں نہایت اعتماد و وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے تمام غیر شادی شدہ زمانہ میں جگر صاحب بہت پاکباز رہے۔ اکثر شعرا کی طرح آپکو امرد پرستی سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اسی زمانہ میں آپ کو مین پوری کی ایک طوائف سے عشق ہو گیا۔ آپنے اپنی غزل

ع خیال ایک جانب نگہ چار سو ہے

پر خود تخمیس کی ہے جو شعلہ طور میں موجود ہے۔ اس کے آخری بند میں آپ نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ جگر صاحب انھیں سرکار کے نام سے یاد کرتے تھے

اوران کے بالاخانے کو طور سے۔ چنانچہ آپ کی نظم "یادِ ایام" میں چند اشعار
میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

دست در دست نگار شوخ و سیر کوہ طور بود حاصل بر تمنائے کہ پنہاں داشتم
کیست؟ کو گوید بہ سرکار۔ راز دل سکین سیام چوں تو کافر ماجرا سرد خراماں داشتم

اس کے علاوہ آپ کے دیوان "شعلۂ طور" کا نام بھی اسی کی غمازی کرتا ہے
آخر آخر میں سرکار نے خود جگر صاحب سے نکاح کی پیش کش کی لیکن چوں کہ
انھوں نے محض ارادۂ حج کی تکمیل کی غرض سے یہ پیش کش کی تھی اس لئے
جگر صاحب کے نازک احساس نے اسے گوارا نہ کیا اور انکار کر دیا۔

میرا خیال ہے کہ یہ عشق شعرا کا روایتی عشق تھا۔ اس سے زیادہ اس کی
کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شیرازن سے میں بھی ملا ہوں۔ وہ مین پوری کی نہایت
نستعلیق اور خوش ذوق ڈیرے دار طوائف ہے۔ مین پوری کے تمام معزز
اور تعلیم یافتہ حضرات اس کے یہاں جاتے تھے۔ جگر صاحب کا بھی وہاں
آنا جانا ہو گیا۔ شاعر کو شعر کہنے کے لئے کسی معشوق کی امداد کی بہر حال ضرورت
ہوتی ہے۔ اس لئے جگر صاحب نے شیرازن سے تعلق خاطر پیدا کر لیا۔ یعنی یہ
تعلق پیدا ہو نہیں گیا بلکہ انھوں نے پیدا کر لیا یا احباب نے پیدا کرا دیا۔

جب اصغر صاحب کا انتقال ہوا اور جگر صاحب نے پھر اپنی سابقہ
بیوی سے نکاح کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے صرف ایک شرط پیش کی

کہ جگر شراب چھوڑ دیں۔ اس شرط کو سُن کر جگر جز بز تو بہت ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد انھوں نے شراب بالکل ترک کر دی اور اپنی سابقہ بیوی سے دوبارہ نکاح کر لیا۔ شعلۂ طور" کی نظم "تجدید ملاقات" اسی کی یادگار ہے۔ ان بیوی سے جگر کو خاص تعلقِ خاطر ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

بھوپال اگرچہ خلد بدامن ہے اے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیم جگر نہیں

بیعت | جگر صاحب پر جب محبوب کی مفارقت میں نیم دیوانگی سی طاری ہو گئی تو حضرت اصغر نے دو علاج کئے۔ اوّل تو اپنی سالی سے عقد کر دیا۔ دوسرے خود آپ کو لے کر اپنے پیر حضرت شاہ عبد الغنی صاحب منگلوری کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوئے اور انھیں ان کا مُرید کرا دیا۔ اس کے بعد جگر صاحب بارہا تنہا بھی حاضر ہوئے لیکن ہمیشہ بڑے حزم و احتیاط سے شراب سے اجتناب کرتے ہوئے۔ پیر نے ان پر خاص توجہ فرمائی اور ان کی اصلاح کی خاص کوشش کرتے رہے۔ جگر کو بھی اپنے پیر سے بڑی عقیدت بلکہ والہانہ شیفتگی تھی اور وہ اب بھی بڑی عقیدت اور سعادت مندی سے انکا تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے شعلۂ طور میں ایک نظم اور ایک فارسی کی غزل بھی ان کے حضور میں بطور نذرِ عقیدت پیش کی ہے۔

خوراک | جگر کی خوراک بہت کم ہے۔ کھانے کے معاملہ میں انکے مزاج

میں انتہائی مشرقیت ہے۔ ناشتہ پر توس مکھن، جام یا چائے پر بسکٹ، کیک پیسٹری انھیں مرغوب نہیں۔ بلکہ انڈا، پراٹھا، بالائی زیادہ پسند ہے۔ کھانے میں زیادہ اعلیٰ قسم کی مرغن چیزیں بھی دل پسند نہیں مثلاً بریانی وغیرہ۔ بس معمولی چیزیں مثلاً قورمہ، قیمہ، پسندے، کباب، اُڑد کی دال، آلو بہت مرغوب ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ خوب چٹپٹی ہوں۔ نمک مرچ وہ عموماً تیز پسند کرتے ہیں۔ بیسنی روٹی کے ساتھ چٹنی، اچار، دہی کا رائتہ انھیں اس قدر پسند ہے کہ اس کے سامنے وہ بریانی اور مرغ کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتے۔ میٹھی چیزوں کے مقابلے میں نمکین چیزیں زیادہ شوق سے کھاتے ہیں۔ میٹھی چیزیں اگر دسترخوان پر ہوں تو بس چکھ لیتے ہیں کہ ان چیزوں کو شکایت نہ ہو۔ چائے بیحد پیتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ پھلوں سے بھی کوئی خاص رغبت نہیں ہے مگر کھا لیتے ہیں۔

اکثر احباب جگر صاحب کی کھانے یا چائے کی دعوت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے افسران اور تاجر بھی اور چھوٹے لوگ بھی۔ ہر شخص اپنی حسب حیثیت زیادہ سے زیادہ تکلفات سے کام لیتا ہے۔ اکثر جگر صاحب کی بدحواسی کی وجہ سے ایک ہی وقت میں دو دو جگہیں دعوتیں ہو جاتی ہیں اور جب جگر صاحب کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اس کی تلافی کے لئے دونوں جگہ شریک ہوتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کھاتے بھی ہیں۔ اس طرح صبح شام دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔

اور صاحبِ خانہ کو جہاں ان کا قیام ہوتا ہے مہینہ میں مشکل سے دس دن انھیں کھانا کھلانے کا فخر حاصل ہو سکتا ہے۔ دعوتوں میں جگر صاحب بہت کم کھانا کھاتے ہیں لیکن بہر حال صاحبِ خانہ کے اصرار پر کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا ہے اور کھانے عموماً مرغن ہوتے ہیں۔ برابر مرغن کھانا کھاتے رہنے کی وجہ سے جگر صاحب کو عام طور پر پیٹ کی شکایات رہتی ہیں اور وہ مستقل قبض سے نالاں رہتے ہیں۔ در اصل کھانے کی اس بے ترتیبی۔ روزانہ رات کو تین بجے عموماً سونا۔ دن بھر بیٹھے رہنا اور زندگی کی عام بے ضابطگی کی وجہ سے ان کو یہ تکالیف رہتی ہیں۔ ویسے جگر صاحب کی شکایت کے باوجود میرا خیال ہے کہ ان کا معدہ زیادہ قوی ہے ورنہ ان حالات میں دوسرا شخص تو اتنے عرصے تک ان دعوتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

مشرقیت جگر صاحب کے خمیر میں مشرقیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مشرقی تہذیب کے وہ اس حد تک دلدادہ ہیں کہ مغربی تہذیب کے مخالف بلکہ اس سے متنفر ہیں۔

لباس میں انھوں نے کوٹ پتلون کبھی نہیں پہنا۔ ہمیشہ بالوں والی سیاہ اونچی باڑھ کی ٹوپی اور شیروانی پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں کسی ملائم کپڑے کی قمیص۔ گرمیوں میں باریک ململ کا کرتہ۔ علی گڈھ فیشن کا تنگ مہری کا پاجامہ جس میں رنگین ریشمی کمربند آگے کافی لٹکا ہوا۔ ایسا بوٹ جو بغیر ہاتھ

لگائے آسانی سے کھل سکے یا سیاہ پمپ یا پھر سلیم شاہی جوتا اور موزے ان کا عام لباس ہے۔ ہر لباس صاف ستھرا۔ اعلیٰ۔ نازک و نفیس اور خوبصورت پہنا کرتے ہیں۔ چاہے تھوڑی دیر بعد اس پر پان کی چھینٹیں پڑی ہوں۔ جاڑوں میں روئی کی مرزئی کے بجائے وہ سوئٹر البتہ پہنتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوڑی دار لکھنوی پاجامے بھی انھیں بہت پسند ہیں اور اکثر پہنا کرتے ہیں۔ ان کی مزاج کی عجلت پسندی اور گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے انکی اس پسند پر تعجب ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ چوڑی دار پاجامہ پہنتے وقت خاصی کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ لیکن اس پسند کے بظاہر دو سبب نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ چوڑی دار پاجامہ قدیم مشرقی تہذیب کی ایک یادگار ہے دوسرے جگر صاحب کی فطرت میں نسائیت کو کافی دخل ہے۔ اس لئے عموماً نسائی یا نازک چیزیں انھیں زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ پھر ان کی شاعرانہ نزاکت پسندی بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے۔

جگر صاحب پان کے کثرت سے عادی ہیں۔ شروع زمانہ میں میں ان کی پان خوری پر حیرت کرتا تھا۔ وہ نگر نگر گھومتے تھے اور مختلف گھروں کے پان کھاتے تھے۔ ہر جگہ اور ہر گھر کا پان کھانے کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہر گھر کا پان خوشی سے کھاتے ہیں۔ کہیں تو لکھنؤ کا اعلیٰ قوام کھا رہے ہیں۔ کہیں معمولی تمباکو۔ اور کہیں بہت ادنیٰ قسم کی بھساکو۔ لیکن اب جب سے

ان کے مالی حالات اچھے ہوئے ہیں وہ اپنا پاندان ہر سفر میں ساتھ رکھتے ہیں اور اس کو اپنی فطری نفاست پسندی کے مطابق بھرتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں مہوبے کے بہترین پان اور پاکستان میں سانچی پان کھاتے ہیں بہترین کانپوری کتھا استعمال کرتے ہیں۔ پرانی جہازی چھالیہ باریک اور گول دانے کی کٹی ہوئی کھاتے ہیں۔ احمد حسین دلدار حسین کا سیاہ تمباکو دانہ انھیں زیادہ پسند ہے۔ اس کے علاوہ خوبصورت سے خوبصورت بٹوے میں چھوٹی الائچی اور لونگ بھی ہوتی ہیں۔ وہ پان کے معاملہ میں بالکل بخیل نہیں۔ عموماً جب پان بناتے ہیں تو پہلے تمام حاضرین کو کھلا لیتے ہیں جب کہیں خود کھاتے ہیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے پان بنانا شروع کیا۔ کافی دیر ہو گئی کہ یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا جو ان غریب کو بھی پان نصیب ہو۔ یہی دیکھ کر ان کے احباب ان کی پانوں کی ڈبیہ بھر کر ان کے پاس رکھ دیتے ہیں۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی پان بنانے اور کھلانے کا دورہ پڑ جاتا ہے۔

جگر ٹیلی فون پر بات چیت کرتے سخت گھبراتے ہیں، کہتے ہیں یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سامنے کوئی مخاطب نہیں اور خود پاگلوں کی طرح بات کرتے چلے جاتے ہیں۔

نظم کہنے کے بھی وہ غالباً اسی لئے مخالف ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کی پیداوار ہے۔

البتہ غالباً اپنی عجلت پسندی کی بنا پر وہ بیل گاڑی کے بجائے ہوائی جہاز سے سفر کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں حالانکہ قلب کے مریض ہیں اور اہتمام کی جھنجھٹ سے بچنے کے لئے وہ حقہ کے بجائے سگریٹ کے عادی ہیں لیکن سگریٹ میں کثرت نہیں ہے۔

تفریحی مشاغل جگر صاحب کھیلوں میں یوں تو شطرنج اور کیرم بھی اچھا کھیلتے ہیں لیکن تاش سے انھیں زیادہ دلچسپی ہے۔ پہلے "حکم کی بیگم" زیادہ کھیلتے تھے جسے وہ ٹیفون کہا کرتے تھے لیکن اب رمی کا زور ہے تاش میں زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے وہ اب شرط سے بھی تاش کھیلنے لگے ہیں۔ اس میں وقت گزاری اور زیادہ سے زیادہ دلچسپی قائم رکھنے کے علاوہ کوئی اور خیال کارفرما نہیں ہوتا یعنی مالی نفع حاصل کرنیکا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ بلکہ عموماً کھیل ختم ہوتے ہی جیت کی تمام رقم بچوں کو تقسیم کردیتے ہیں۔

رفتہ رفتہ جگر صاحب کے یہاں تاش کا انہماک بڑھتا گیا اور اب تو یہ حالت ہوگئی کہ اکثر ۴۸ - ۴۸ گھنٹے مسلسل تاش جاری رہتا ہے جو احباب آپ سے ملنے آتے ہیں وہ اگر تاش نہیں جانتے یا اس کھیل سے دلچسپی نہیں رکھتے تو عموماً بہت بے کیف ہوکر واپس جاتے ہیں۔ کیونکہ جگر صاحب تاش میں اس طرح کھوئے ہوئے ہوتے ہیں کہ سرسری ایک، آدھ جملے کے علاوہ انھیں صحیح

معنوں میں اس کا بھی ہوش نہیں ہوتا کہ کون آیا اور کب گیا۔ گویا اگر پہلے جگر اور شراب مترادف الفاظ کہے جا سکتے تھے تو اب جگر اور رمی۔

تاش میں اس غیر معمولی انہماک کے معاملہ میں جگر صاحب سے اکثر تبادلۂ خیال کا موقع ہوا۔ جگر صاحب کا فرمانا یہ ہے کہ "تمھیں اندازہ ہوگا کہ کسی چیز میں غرق رہنا یعنی خود فراموشی میری فطرت ہے یا بن گئی ہے۔ جوانی تک میں شاعری میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ جوانی گزرنے کے بعد جذبات میں وہ اُمنگ جو شاعری پر مجبور کرتی ہے، صرف کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے اس لئے شاعری میں اب وہ انہماک یا خود فراموشی باقی نہیں رہی۔ رہا احباب کی مجلس میں شعر سُنانا تو ایک تو جب تک کوئی نئی غزل نہ ہو وہی پُرانے اشعار سُنانا طبیعت کو پسند نہیں۔ دوسرے شعر سنانے میں جو پھیپھڑوں پر زور پڑتا ہے اب گرتی ہوئی صحت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اب رہا خود فراموشی کا دوسرا ذریعہ یعنی شراب، وہ ترک ہی کر دی ہے۔ پھر مجھے خود فراموشی اور وقت گزاری کے لئے کچھ نہ کچھ تو چاہیئے اور یہ میری عادت ہے جو کام بھی کرتا ہوں اسمیں اعتدال کی حدوں پر نظر نہیں رہتی لہٰذا میں نے تاش شروع کر دیا ہے اور اس میں اس قدر انہماک پیدا ہو گیا ہے۔"

لیکن جگر صاحب اپنے مکان گونڈے میں جتنے دن رہتے ہیں بیوی سے لڑائی کے خوف سے عموماً تاش نہیں کھیلتے۔ ویسے بھی وہ شراب کی طرح

تاش سے بھی چند دنوں کے لیئے عارضی توبہ کر لیتے ہیں اور پھر بہت ہی دلچسپ طرح سے دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بھوپال کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جبکہ وہ اور ان کی بیگم دونوں میرے یہاں مقیم تھے۔ تاش کے ان کے اس انتہائی انہماک پر دونوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ بالآخر جگر صاحب کو تاش سے توبہ کرنی پڑی۔ اب جگر صاحب جو احباب کی محفل میں آئے تو ایک دو دن تو تاش کے مسئلہ کو ٹالتے رہے۔ آخر احباب سے کہا "تم کھیلو۔ مجھ پر دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔" احباب نے کھیلنا شروع کیا۔ جگر صاحب ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد کھسکتے کھسکتے کھیلنے والوں کے قریب آ گئے اور اُچک اُچک کر پتّے دیکھنے اور کبھی کبھی کھیلنے والوں کو بے تعلقی سے مشورہ دینے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ بے تعلقی غصہ میں تبدیل ہو گئی۔ اب وہ جھنجھلا کر کہتے "یہ نہیں، وہ پتّہ ڈالو" رفتہ رفتہ جھنجھلا کر اپنے ہاتھ سے پتّہ کھینچ کر پھینکنے لگے اور پھر کھیلنے والے کی کسی آئندہ غلطی پر اسکے ہاتھ سے پتّے چھین لیئے اور اس کی جگہ خود سنبھال لی۔ لیجیے توبہ ختم ہو گئی۔

جگر صاحب کو تاش کے علاوہ اور کسی کھیل سے دلچسپی نہیں ہے۔ نہ سیر و تفریح کا کوئی خاص شوق ہے۔ مناظرِ قدرت کو دیکھنے اور ان سے متاثر ہونے کی بھی عادت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی کاہلی بہت آڑے آتی ہے۔ وہ شاعرانہ انداز سے اکثر کہا کرتے ہیں کہ "یہ تمام مناظر خود میرے اندر موجود ہیں۔
ع جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ میں ان کو دیکھنے کے لیئے کہیں جا کر کیا کروں گا"

تنہائی بھی پسند نہیں۔ اس سے سخت الجھتے ہیں۔ وہ بس یہ چاہتے ہیں کہ بہت سے احباب جمع ہوں اور ہنگامہ رہے۔

شراب جگر شراب کے بہت زیادہ عادی تھے۔ گویا جگر کا تصور شراب کے بغیر نامکمل تھا۔ شراب کے معاملہ میں جگر انتہائی بے ضابطہ تھے اور کچھ جگر پر منحصر نہیں شراب ہوتی ہی ہے ضابطوں کی ضد۔ میں نے بہت سے شراب پینے والوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور بجز جوش کے کسی کو شراب کے معاملہ میں کسی اصول اور ضابطہ کا پابند نہیں پایا ہے۔ جوش کے یہاں اس قدر ضابطہ البتہ دیکھا ہے کہ وہ دن میں شراب نہیں پیتے اکثر ایسا بھی دیکھا ہے کہ جگر اختر شیرانی۔ آزاد انصاری، دن میں شراب پی رہے ہیں اور جوش اپنے ہاتھ سے انھیں پلا رہے ہیں مگر مجال ہے کہ غروب آفتاب سے پہلے وہ ایک گھونٹ بھی چکھ لیں لیکن ادھر دن غروب ہوا اور اُدھر جوش بے چین ہوئے۔ پھر پینا شروع کردی۔ رات گئے وہ کھانا کھاتے جس میں روٹی کم اور روکھا گوشت زیادہ کھاتے۔ اس کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی کرتے پھر سو جاتے۔ صبح اٹھکر غسل کرنا اور لیموں کے شربت کا ایک گلاس پینا ان کا معمول تھا۔ غرض جوش کے سوا میں نے کسی کو شراب کے معاملہ میں اتنا ضابطہ کا پابند نہیں دیکھا ہے اور جگر کے لیئے تو کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا۔ وہ پینا شروع کرتے تو پیتے چلے جاتے اچھی بُری شراب سے کوئی مطلب نہیں۔ بس شراب ہو۔ اس میں پانی، سوڈا یا

برف کی آمیزش بھی نہ کرتے۔ اس کو وہ شرک کہتے اور سمجھتے تھے۔ خالص شراب پیتے اور بوتل سے مُنھ لگا کر براہِ راست پیتے کہ پیتے پیتے بالکل مدہوش ہو جاتے ذرا ہوش آتا تو پھر پیتے۔ جتنی شراب سامنے ہوتی وہ ایک دَم پیٹ میں ڈال لینے کی کوشش کرتے کیونکہ "حکیم" قسم کے احباب سے ڈرتے تھے کہ کہیں نگاہ بچا کر پھینک نہ دیں۔ یہ سلسلہ کئی کئی دن تک چلتا رہتا۔ اس عرصے میں کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا۔ احباب نے کسی وقت اصرار کر کے کچھ کھلا دیا تو اُلٹا سیدھا پیٹ میں ڈال لیا اور وہ بھی اس بُرے انداز میں کہ دیکھنے والے کے مذاق کو گراں گزرتا۔ ورنہ جگر اور شراب۔ شراب اور جگر۔ آخر کئی کئی دن بعد یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا اور چند روز جگر ہوش میں رہتے تھے۔ پھر وہی شراب تھی اور وہی جگر۔ ہوش کی حالت میں احباب ان کو شراب سے دور رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شراب ان کے لئے آسمان سے ٹپکتی ہے۔ وہ خود بھی اکثر کہتے تھے کہ مجھے میرا خدا شراب پلاتا ہے۔ پھر تم لوگوں کی کیا مجال کہ اسے روک سکو۔

کہتے ہیں کہ شراب انسان کو بالکل عریاں کر دیتی ہے اور شراب کی حالت میں انسان کی حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جگر کی حقیقت نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ جگر کبھی زیادہ سے زیادہ مدہوشی کے عالم میں بھی فواحش نہیں بکتے۔ فواحش بکنا تو کجا کبھی عورت کا ذکر تک نہ کرتے۔

ہمیشہ ابتدائی سرور میں وہ اشعار پڑھتے ہیں لیکن بے ربط۔ اور سرور زیادہ ہونے پر ان پر فلسفہ طاری ہو جاتا ہے یا اَلم اور مصائب اُبھر آتے ہیں۔ اکثر روتے ہیں اور ہمیشہ شراب پر نفرین کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب اکثر انکے احباب یہ شاعری بھی کرتے ہیں جیسے کہ رشید احمد صدیقی نے آتشِ گل کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "جگر کی شاعری دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا کہ یہ شخص شراب ترک کئے بغیر نہ رہے گا۔" لیکن در اصل یہ ان کی مخلصانہ خواہش اور دل کی آواز تھی۔ جامعہ میں ایک اُستاد مولانا شرف الدین صاحب یاس ٹونکی تھے۔ نہایت صاحبِ ذوق اور بہت متشرع بزرگ تھے۔ جگر ان کی خدمت میں بے حد گستاخ تھے شراب سے مست ان کے گلے میں باہیں ڈال کر ان کی سفید ڈاڑھی کے بوسے لیتے لیکن مولانا بڑے حلم سے سب انگیز کرتے۔ جب وہ حج سے واپس آئے تو جگر سے فرماتے تھے "جگر میں نے مدینہ طیبہ میں حضورؐ کے مزارِ اقدس کی جالی پکڑ کر صرف دو دعائیں مانگی تھیں۔ ایک تو اپنی مغفرت کی اور دوسری تمھاری شراب چھٹنے کی۔" تو در اصل بزرگوں اور احباب کی انہی دُعاؤں کا اثر تھا کہ جگر نے شراب ترک کر دی اور شراب ترک کرنے کے بعد ہی سے انکی حالت بدل گئی۔ اُن پر روپیہ کی بارش ہونا شروع ہو گئی۔

اکثر پینے والے اپنے ساتھ دوسرے پینے والوں کو شریک کرتے اور نہ پینے والوں کو زور دے کر پلاتے ہیں لیکن جگر صاحب تنہا نوش تھے، اور

انھوں نے کسی صالح مسلمان کو جو شراب نہ پیتا ہو نہ کبھی شراب پینے کے مُعاملہ میں زور دیا نہ اسے شراب پیش کی بلکہ ہمیشہ منع ہی کرتے رہے۔

جگر صاحب نے کب سے شراب شروع کی اس کا صحیح علم نہیں ہے لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بیوی کی محبت میں یہ شغل شروع اور آخری بیوی کے اشارے پر اسے ترک کیا۔

موسیقی جگر صاحب کو موسیقی میں بھی تھوڑا بہت دخل ہے۔ اور جس زمانے کی تہذیب کے جگر صاحب پروردہ ہیں اس زمانہ میں موسیقی کا علم مردوں کے لئے اس تہذیب میں داخل سمجھا جاتا تھا۔ پھر ابتدائی زمانہ میں جگر صاحب کا ماحول بھی موسیقی نواز رہا ہے۔ ان کی پہلی بیوی ایسے ہی طبقہ کی ایک فرد تھیں اور ان کی تین پوری والی "سرکار" بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے جگر صاحب کو بھی موسیقی میں کافی درک پیدا ہو گیا۔ خوش گلو وہ پہلے ہی سے تھے اس لئے تھوڑی بہت مشق بھی ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جگر صاحب ترنّم سے شعر پڑھنے میں نئے نئے دلکش طرز اختیار کرتے رہے اور انکے پڑھنے میں اس قدر دلآویزی ہے کہ سارا مجمع جھُومنے لگتا ہے۔

ویسے کبھی کبھی تنہائی میں اپنے خاص الخاص احباب کی موجودگی میں وہ اکثر چیزیں گانے بھی لگتے ہیں۔ مثلاً غالب کی غزل۔ ع۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔ میں نے بہت دلکش انداز میں

ان سے سنی ہے۔ لیکن ایسا فرمائش سے کبھی نہیں کرتے۔ بس کبھی اپنی ترنگ میں گانے لگتے ہیں۔

خوشنویسی جگر کافی خوشخط بھی ہیں اور اگر موج میں ہوں تو زیادہ لکھنے سے بھی جان نہیں چُراتے۔ چنانچہ اگر وہ پڑھتے ہوں اور کوئی انکے اشعار لکھنا چاہے تو اسے اشارے سے روک دیتے ہیں۔ پھر بعد میں اسے پُوری غزل اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیدیتے ہیں۔ ان کے خط میں کافی خوشنمائی ہے اور اگرچہ یہ کہنا غالباً صحیح نہ ہوگا کہ ان کی تحریر خوشنویسی کے اصولوں پر پوری اترتی ہے لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی زمانے میں خوشنویسی کے اصول اچّھی طرح ذہن نشین کرکے ان کی مشق کی ہے۔ وہ اکثر احباب کی فرمائش پر اور بعض مرتبہ اپنے تحفۂ خلوص کے طور پر اپنی غزلیں لکھ لکھ کر لوگوں کو دیا کرتے ہیں۔ یہ صورت حج سے واپسی پر زیادہ ہوئی جب انھوں نے اپنی ایک تازہ نعت کی جو دربار سرورِ کائناتؐ میں پیش کی گئی تھی، بلا مُبالغہ اس کی درجنوں نقلیں خوشخط لکھ کر اور فریم کراکے اپنے احباب کو تقسیم کی تھیں۔ اور میں نے تو ایک زمانہ میں ان کی اکثر غزلوں کے بعض منتخب اشعار کی ان سے وصلیاں لکھوا کر فریم کرالی تھیں جو افسوس ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت سب وہیں رہ گئیں۔

خوشنویسی کے علاوہ آپ کو سجاوٹ کے گل بُوٹے بنانے کی خاص

نسبت بسرورِ کونین صلعم

ای از لبِ ماہ در شنیدہ / نادیدہ عنبر ... دیدہ

ای بر تو سپرد مہ [illegible] / [illegible]

ای آنکه ز شوقِ بے نہایت / طے کردہ مراحل و منازل / در سدرہ بہ منتہائے قوسین

حق را ہمہ آشکار دیدہ / تا سدرہ بپائے عشق رسیدہ / با عظمتِ خاص، رہ بریدہ

حقیقتِ معراج

ای آنکه درونِ پردہ راز / کے عقل تو راں رسد بہ پایان

از خویش بہ خویشتن رسیدہ / ہم عشق ہنوز نارسیدہ

لولاک لما خلقت الافلاک

در مدحِ تو جانِ ہر قصیدہ

"نقوش و نقطع"

[illegible]

بپاسِ خاطر:- برخوردار شاہد علی خاں سلمہٗ
ابن یارِ دیرینہ محمود علی خاں صاحب

مشق ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کا خبط ہے۔ آپ اگر خالی بیٹھے ہوں سامنے کاغذ پنسل یا کوئی کتاب پڑی ہو بس اس پر گل بوٹے بنانا یا خطِ طغرا میں فوراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا شروع کر دیں گے۔ شاعری کی جب آپ پر کیفیت طاری ہوتی ہے تو یہ صورت زیادہ ہو جاتی ہے۔ آپ کے تمام خطوط اس سے مزیّن نظر آتے ہیں۔ اکثر ان گل بوٹوں نے بڑی متحیر سُراغ رسانی بھی کی ہے۔ کراچی میں مسٹر علاء الدین خالد کی موٹر میں آپ حسبِ معمول اپنا بٹوہ بھول گئے جس میں کئی ہزار روپئے تھے۔ جب خالد صاحب نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں روپیوں کے علاوہ ایک پُرزہ بھی ملا جس پر گل بوٹے بنے ہوئے تھے بس آپ سمجھ گئے کہ اس کا مالک کون ہو سکتا ہے اور اسے جگر صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ اکثر میری لڑکی نے جگر صاحب کی اس مشق بیکاری کے کاغذ چُن کر اس کے نقش و نگار کو کاڑھا بھی ہے اور کبھی کبھی ان سے فرمائش کر کے بنوالئے بھی ہیں۔

حافظہ | جگر صاحب کو شکایت ہے کہ وہ سنہ۔ مقامات اور لوگوں کے نام یاد نہیں رکھ سکتے۔ یہ عین قرین قیاس ہے۔ کیونکہ جگر صاحب زندگی میں زیادہ تر جہانیاں جہاں گشت رہے ہیں۔ مختلف شہروں کے مختلف محلّوں میں ٹھیرتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کے نام بھول جانا ممکنات سے ہے۔ آپ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جس شہر میں جس کسی کے یہاں ایک دفعہ ٹھیر گئے، پھر ہمیشہ

کوشش کرتے ہیں کہ وہیں ٹھیریں۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا کہ آپ بلا اطلاع کسی شہر میں پہنچ گئے۔ اب اسٹیشن سے تانگہ پر روانہ ہوتے ہیں اور محلہ محلہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ ہم کہاں ٹھیرا کرتے ہیں۔ اگر کوئی پہچاننے والا مل گیا اور ضرور مل جاتا تو اس نے ٹھکانے سے پہنچا دیا۔

جگر صاحب ہر جگہ بھانت بھانت کے آدمیوں سے کثرت سے ملتے ہیں۔ ہر شخص جگر صاحب کے ملنسار رویہ کی بنا پر بہت جلد آپ سے بے تکلف ہو جاتا ہے لیکن ہر شخص کا نام تو کجا اس کی شکل ہی سے اسے یاد رکھنا معمولی بات نہیں، پھر بھی جگر صاحب بیشتر حضرات کو فوراً یا ذرا تامل کے بعد پہچان لیتے ہیں اور نہ پہچاننے کی صورت میں دیکھنے والوں کے لئے وہ تماشہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ اکثر اصحاب ان سے شکایت کرتے ہیں کہ فلاں جگہ فلاں موقع پر ملاقات ہوئی تھی شاید آپ بھول رہے ہیں تو جگر صاحب جواباً یہی فرماتے ہیں کہ آپ نے کوئی ایسا نقش میرے ذہن پر کیوں نہ چھوڑا کہ میں اسے فراموش نہ کر سکتا۔

ویسے میرا خیال یہ ہے کہ جگر صاحب کا حافظہ بہت زبردست ہے جتنے زیادہ لوگوں کو وہ یاد رکھتے ہیں یہ بھی ہر شخص کے لئے آسانی سے ممکن نہیں۔ ان کے حافظے کے قوی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب تک ان کا دیوان شعلہ طور طبع نہیں ہوا تھا اس وقت تک انھیں اپنا پورا دیوان حفظ یاد تھا اور اب بھی وہ جو غزل چاہتے ہیں بیاض دیکھے بغیر پوری کی پوری سنا دیتے

ہیں۔ ہمیشہ مشاعروں میں انھیں کبھی بیاض یا کسی لکھے ہوئے پرچہ کی مدد لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اکثر مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ اگر غزل اپنی کہی ہوئی ہے کسی دوسرے سے نہیں کہلوائی ہے تو اسے بھول جانے کے کوئی معنی ہی نہیں، اور اس کے لئے بیاض کی کیا ضرورت ہے۔

بَدحَواسی جگر صاحب کے مزاج میں انتہائی بَدحواسی ہے۔ کچھ تو یہ بدحواسی ان کی فطرت میں ہے اور کچھ شعر و شراب نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ مانا کہ شراب وہ ترک کر چکے ہیں لیکن اب بھی ان کی حالت پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا خمار اب تک باقی ہے۔ دراصل یہ شراب سے زیادہ شعر کا سحر آگیں نشہ ہے جو ان پر ہر وقت طاری و ساری رہتا ہے۔ وہ اپنی تمام حرکات و سکنات سے مجسّم شعر معلوم ہوتے ہیں۔ شراب کے زمانہ میں بھی اور ہوش و توبہ کے زمانہ میں بھی۔ ان پر خود فراموشی کا پورا تسلط رہتا ہے اور اپنی شاعرانہ حرکتوں سے احباب کے لئے وہ ہمیشہ دلچسپی کا سامان مہیّا کرنیکا سبب بنے رہتے ہیں۔ ہر جاننے والے کو ان کی بدحواسی کے کچھ نہ کچھ نئے قصے معلوم ہوں گے۔ اگر انھیں جمع کر کے لکھا جائے تو پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ہم نے آخر میں ان کے چند لطائف شامل کر دیئے ہیں۔

اسی بدحواسی کے سبب ان کی چیزیں بہت کھوتی رہتی ہیں۔ روپیوں کا پرس جس میں پانچ پانچ سو روپیہ تک ہوتے ہیں، بارہا کھو جاتا اور فاؤنٹن پن

گھڑی۔ پانوں کی ڈبیہ وغیرہ تو ایک مہینے سے زیادہ ان کے پاس نہیں رُکتی۔

ایفائے وعدہ جگر صاحب اپنی بدحواسی اور بے ضابطگیوں کے باوجود وعدے کے سخت پابند ہیں۔ وہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ جس کسی سے جو وعدہ کیا جائے وہ حتی الامکان ضرور پورا کیا جائے۔

اکثر ایک وقت میں دو دو جگہ دعوت یا مشاعرے کی شرکت کے وعدے ہو جاتے ہیں۔ غلطی معلوم ہونے پر وہ معذرت کرتے اور تلافی کے طور پر دونوں جگہ شرکت کرتے ہیں۔ کہیں باہر مشاعرے کی شرکت پر رضامندی ظاہر کر دینے پر جب انھیں پیشگی کرایہ یا نذرانہ کے روپیہ وصول ہو جاتے ہیں تو وہاں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ اکثر شعرا کے متعلق یہ شکایت سُنی گئی ہے کہ کرایہ کا روپیہ وصول کرنے کے باوجود وہ شریک نہیں ہوتے۔ جگر صاحب کے متعلق اس قسم کی شکایت کبھی نہیں سُنی۔ جب ان کی مالی حالت خراب تھی جب بھی اور اب بھی نشے کی حالت میں بھی وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے۔

سراپا جگر کا سراپا لکھنے کے بجائے بس اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ وہ سراپا شاعر ہیں۔ اس معاملہ میں دوسرا کوئی شاعر ان کے مقابلہ کو نہیں پہنچتا۔

سر پر بڑے بڑے بال جو عموماً انگریزی بالوں سے زیادہ لمبے ہوتے ہیں کبھی یہ بال اتنے لمبے ہو جاتے ہیں کہ پٹے دار بالوں کا شبہ ہونے لگتا۔ چھوٹا قد یعنی درمیانہ سے ذرا دبتا ہوا۔ اکہرا جسم لیکن ترکِ شراب کے بعد پیٹ تھوڑا سا

نمایاں نظر آنے لگا ہے بحیثیتِ مجموعی سڈول جسم۔ ناک موٹی۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک اور نشیلا پن۔ رنگ سیاہ۔ ڈاڑھی خشخشی بعضی چہرے پر روائتی کم روئی کے باوجود ایک خاص قسم کی دلآویزی جو شعر کہتے کے زمانے میں اور شعر پڑھتے وقت زیادہ دلکش ہوجاتی ہے۔ چہرے کے بعض نقوش میں ایک سختی سی ہے جو غالباً کثرتِ شراب کا نتیجہ ہے۔ شعلۂ طور کے پہلے ایڈیشن میں جو مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا تھا، ان کی ایک تصویر شامل ہے جو ادیا ما آرٹسٹ کی کھینچی ہوئی ہے۔ اس تصویر میں ان نقوش کی کمی تھی، جگر نے دیکھی تو اپنے ہاتھ سے چند خطوط کھینچکر ان کو واضح کر دیا۔ پہلے جگر صاحب باہر نکلتے تو عموماً شیروانی کاندھے پر ڈال کر نکلتے لیکن اب پہن تو لیتے ہیں لیکن سب یا چند بٹن ضرور کھلے رہتے ہیں اور کمر بند ضرور لٹکتا رہتا ہے۔

وضعداری جگر صاحب اپنی بے ضابطہ زندگی اور بدحواسی کے باوجود بہت ہی وضعدار آدمی ہیں۔ وہ پُرانی مشرقی تہذیب کے مُطابق اپنی وضعداری کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو خاص خاص احباب اُن سے ملنے آتے ہیں جہاں تک ہوسکتا ہے وہ بازدید کو ان سے مِلنے ضرور جاتے ہیں۔ ہر شہر میں جب پہنچتے ہیں تو وہاں کے خاص خاص حضرات جن کے مکان پر ان کو جانا چاہیئے ان کے ذہن میں رہتے ہیں۔ پھر کسی نہ کسی وقت وہ فرصت نکال کر وہاں ضرور جاتے ہیں۔ ان کے اہل وعیال کی خیریت پوچھتے ہیں اور انکے بچّونکو

پانچ دس روپیہ ضرور دیتے ہیں۔ اس میں اپنی مصروفیت کے باوجود وہ کبھی ناغہ نہیں کرتے۔

غرور جگر صاحب میں غرور نام کو نہیں۔ بیحد منکسر المزاج ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے سے مراتب کا لحاظ کر کے ملتے ہیں۔ کراچی میں ایک پہلوان[1] صاحب جو مراد آباد کے رہنے والے ہیں، معمولی سی دودھ کی دوکان کرتے ہیں۔ ادب سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں۔ صرف پرانے تعلقات اور ذاتی عقیدت کی بنا پر جگر صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور جگر صاحب اپنے کسی رویہ سے یہ ثابت نہیں ہونے دیتے کہ وہ پہلوان صاحب کو اپنے کسی دوسرے ملاقاتی سے کمتر سمجھتے ہیں۔ جگر صاحب کو اگرچہ اپنی موجودہ ادبی حیثیت اور اپنی موجودہ پوزیشن کا پوری طرح احساس ہے لیکن اس پر بھی انھیں غرور بالکل نہیں۔ البتہ بڑوں کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ تنے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ جگر صاحب کہیں جانے کو تیار تھے کہ اتنے میں اڈمنسٹریٹر کراچی کا آدمی آیا اور کہا کہ موصوف کے یہاں احباب کی محفل گرم ہے۔ مجھے آپ کو لینے بھیجا ہے۔ انھوں نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ انھیں پہلے مجھ سے ملنا چاہیئے تھا۔ پھر میرا پروگرام طے کرتے تب آپ کو لینے کو بھیجتے تو میں چلتا۔ یوں میں اپنا دوسری جگہ کا پروگرام نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر علیحدہ کہنے لگے، یہ افسران ہم کو اپنے احباب کی محفل کی رونق کے لئے ایک تفریح کا سامان سمجھتے ہیں کہ ہر شاعر ان کے دربار میں

---

[1] عبدالستار عرف ہینگو پہلوان کانپوری

حاضر ہو کر اپنا کلام سنا جائے گا۔ لیکن اس کے لئے بھی چند آداب ہوتے ہیں جن کا لحاظ رکھنا فریقین کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ غرض بڑے آدمیوں کے ساتھ جنھیں اپنی افسری یا دولت کا بہت احساس ہو اور اس سے وہ جگر صاحب کو متاثر کرنا چاہیں تو ان کے ساتھ ان کا رویّہ متمردانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں چھوٹے یا غریب لوگوں کو وہ اپنے کسی رویّہ سے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیتے۔ گویا ان کے تعلقات کا انحصار انسان کی چھوٹائی اور بڑائی پر نہیں ہے بلکہ اُس سے ذاتی تعلقات یا اُس کی ادبی حیثیت ہے۔ نیز ان میں حد سے زیادہ مروّت کا مادہ موجود ہے۔

غصّہ جگر صاحب غصیلے مزاج کے آدمی نہیں۔ ان میں حلم اور برداشت کا مادّہ بہت زیادہ ہے۔ البتّہ تین صورتوں میں ان کو سخت جھنجھلاہٹ آجاتی ہے اور اس جھنجھلاہٹ میں بگڑ کر وہ ایسے ہی کوئی اشارہ کر دیتے ہیں جو ان کی غزل کی جان یا بنیاد ہیں یعنی کوئی ہلکی سی معمولی سی بات کہہ دیتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ میں نے بہت سخت بات کہہ دی ہے جو اُٹھلائے نہ اُٹھے گی، دھوئے نہ چُھٹے گی۔ ایک تو تاش، شطرنج، کیرم کھیلنے میں جب وہ ہارنے لگیں یا ان کا پاٹنر کوئی غلط چال چل جائے تو وہ پھٹ پڑتے ہیں۔ دوسرے کسی علمی یا ادبی بحث کے دوران جب مقابل ان کے نقطۂ نظر کا قائل نہیں ہوتا اور وہ مختصر گوئی کی فطری معذوری کی وجہ سے اپنی بات جس پر انھیں زیادہ اعتماد ہوتا ہے منوا لینے میں اپنے

آپ کو بے بس پاتے ہیں تو انھیں سخت جھنجھلاہٹ آجاتی ہے۔ تیسرے ان کے مزاج میں بڑی عجلت اور گھبراہٹ ہے۔ اکثر سواری پر کہیں جاتے ہیں تو راستہ میں سوال کرتے جاتے ہیں" ابھی جگہ آئی نہیں، کہاں اترنا ہے" غرض جب ان کے کسی کام میں کوئی رکاوٹ یا تاخیر ہوتی ہے تو جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے اور اس وقت تک الجھن قائم رہتی ہے جب تک وہ کام تکمیل کو نہ پہنچ جائے اس کے بعد نہ صرف جھنجھلاہٹ رفع ہو جاتی ہے بلکہ اس کا کوئی خیال بھی نہیں رہتا ہے۔ گویا طبیعت کینہ پرور بالکل نہیں۔ ویسے ان تین موقعوں کے علاوہ انھیں کبھی غصّہ کرتے نہیں دیکھا۔

یوں وہ احباب کے ہر وقت گھیرے رہنے سے مستقل طور پر پریشان رہتے ہیں چاہے وہ کہیں ٹھیرے ہوں اِدھر ابھی سو کر اٹھے نہیں ہیں کہ ملنے والوں کی ایک ٹولی آموجود ہوئی۔ یہ سلسلہ رات گئے تک برابر جاری رہتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ خود کتنی ہی تکلیف اُٹھالیں کسی کو کج خلقی کی شکایت نہیں ہونے دیتے۔ سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ اپنی پریشانی کے باوجود یار باشی کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ مجمع کے بغیر چین نہیں آتا۔ اکثر انھیں مکان کے کسی اندرونی حصّے میں ہٹا دیا گیا کہ ذرا آرام کرلیں لیکن جیسے ہی انھیں معلوم ہوا کہ کوئی صاحب باہر بیٹھے ہیں فوراً یا خود باہر نکل آتے ہیں یا انھیں اندر بلا لیتے ہیں اکثر ایسا بھی ہوا کہ انھیں کسی تنہائی کے مقام پر لیجایا گیا کہ چند روز کو سکون مل جائے

لیکن وہ دو ایک دن میں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا آس پاس کسی قسم کا مجمع تلاش کر کے وقت گزاری کے لئے اس میں بیٹھنے لگتے ہیں۔

خلوص جگر صاحب سراپا خلوص ہیں اور جو لوگ خلوص سے ان سے ملتے ہیں انہی سے وہ قریب تر ہو جاتے ہیں۔ ریا کاری ان کی زندگی میں نہیں۔ اس کے وہ سخت مخالف ہیں حتیٰ کہ شاعر کے کلام اور اس کی نجی زندگی میں فرق کو بھی وہ ریا کاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا احساس بھی بہت تیز ہے۔ اگر کسی ملنے والے کے خلوص میں ذرا سا فرق ہوا تو فوراً انھیں اس کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اس سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شہر کے تانگے والے یا ادنے طبقے کے لوگ جمع ہو کر ان کے پاس آئے اور کلام سننے کی فرمائش کی جگر صاحب نے بڑی خوش دلی سے ایک دو غزل سُنا کر خوش خوش انھیں واپس کیا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی مرد معقول قسم کے صاحب ان کے پاس آئے جگر صاحب نے انھیں دیکھا۔ دو ایک باتیں کیں۔ پھر کسی بہانے سے اٹھ کر وہاں سے ایسے غائب ہوئے کہ دو چار گھنٹے پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر جب واپس آئے تو ان صاحب کے کردار کے متعلق چند ایسی باتیں بیان کیں کہ سُنکر سب کو حیرت ہو گئی۔ گویا جگر صاحب ان سے برسوں سے واقف تھے۔ حالانکہ پہلے کبھی ملے بھی نہ تھے۔

خوش چلنی شراب اور طوائف کے ذکر کے ساتھ ممکن ہے قارئین کو

کوئی غلط فہمی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ جگرؔ بہت ہی خوش نظر اور خوش چلن بھی ہیں۔ اور یہ میں اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ جگرؔ پر اکیلے گھر میں اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کو بے فکری سے چھوڑا جا سکتا ہے۔ یوں تو اس قسم کے بہت سے واقعات میرے علم میں ہیں لیکن یہاں صرف ایک واقعہ لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں جس میں جگرؔ کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

جگرؔ صاحب کا بھوپال میں میرے یہاں قیام تھا۔ زنانہ میں صرف میری بیوی تھیں اور مردانے میں جگرؔ صاحب ٹھیرے تھے۔ ایک دن میں دفتر گیا ہوا تھا کہ بھوپال کی کچھ باذوق پردہ دار خواتین جمع ہو کر آئیں اور میری بیوی سے انھوں نے فرمائش کی کہ ہمیں جگرؔ کا کلام سننے کا اشتیاق ہے اور جگرؔ آپ کے یہاں مقیم ہیں اس لئے آپ ان کا کلام خود ان کی زبان سے سنوا سکتی ہیں میری بیوی نے اپنے اوپر اعتماد کی بنا پر ان سے وعدہ کر لیا اور ان کی ضروری تواضع کرنے کے بعد ملازمہ کو جگرؔ صاحب کے پاس بھیجا اور ان مہمان خواتین کی فرمائش کہلائی۔ جگرؔ صاحب نے جواب دیا کہ "میں بڑے شوق سے کلام سنانے کو حاضر ہوں لیکن ان سے کہہ دیجئے کہ جب محمود صاحب گھر میں ہوں تب تشریف لائیں یا اس وقت تک ٹھیریں۔ اگر ان کے ہمراہ کوئی مرد بھی ہوتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن موجودہ صورت میں وہ مجھے معاف کر دیں"۔ اس جواب کو سنکر میری بیوی خاموش ہو گئیں۔ جب میں دفتر سے آیا تو مجھ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ میں نے

سمجھا یا کہ جگر صاحب کا رویہ کیوں کر بالکل صحیح تھا۔

اس واقعہ سے جگر صاحب کے کردار کے اس پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ جگر صاحب اپنے احباب کے گھر کی خواتین کے معاملہ میں کس حد تک معتبر اور قابلِ اعتماد ہیں۔

طرزِ گفتگو جگر کا بات چیت کا انداز نہایت بے ربط اور غیر مسلسل سا ہوتا ہے۔ وہ... گی بات چیت میں بھی گویا غزل کہتے ہیں۔ غزل کے اشعار میں عموماً ہلکے پھلکے اشارے کئے جاتے ہیں یہی اشارات وہ اپنی عام بات چیت میں بھی کرتے ہیں اور یہ اشارے کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کا مفہوم نہ صرف ادا ہو گیا بلکہ انھوں نے بہت بڑی اور نہایت پتے کی بات کہہ دی ہے۔ ویسے بھی جگر صاحب گفتار کے غازی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے علاوہ اپنی بات چیت سے اپنے نظریوں یا اپنے خیالات کی تائید یا اِشاعت نہیں کر سکتے۔ شرح و لبسط یا تفصیل ان کے مزاج میں ہے ہی نہیں۔ اس لئے کسی بحث کے دوران معذور محض..... اور بے بس نظر آتے ہیں۔ ان کی گفتگو بیحد دلچسپ ہوتی ہے اور باوجود کوشش کے میں ان کی نقل کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ یہ کمال شوکت تھانوی کو حاصل ہے۔ وہ جگر صاحب کا بہت کامیاب چربہ اُتارتے ہیں۔

شراب کا خرچ جگر کثرت سے شراب پیتے تھے اور جس زمانہ میں

وہ پینے کے عادی تھے ان کا ذریعہ آمدنی کچھ نہ تھا مشاعروں میں فیس لینا بھی انھوں نے شروع نہ کی تھی۔ اگر ان کے پاس کچھ روپیہ ہوتا بھی تو اسے بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ گویا ان کی شراب کا تمام بار ان کے احباب کی جیب پر تھا۔

شراب طلب کرنے کے لئے وہ بہانہ تراشی کے نفسیاتی ماہر تھے۔ جیسا آدمی دیکھتے اسی کے مطابق اس سے بات چیت کرتے۔ کسی کے جذبات کو اپیل کرتے، کسی کی مہمان نوازی کو۔ کسی کو مشاعرہ خراب ہوجانیکا خوف دلاتے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ عموماً وہ مشاعرہ خراب کرنے ہی کے لئے عمداً پیتے تھے۔ کسی سے غصہ ہو کر کہتے تو کسی کو روٹھ جانے کی دھمکی دیتے جب کچھ بن نہ آتی تو خوشامد بھی کر لیتے تھے۔ شراب کے لئے وہ عموماً بہت تھوڑے پیسے مانگتے اور جیسے پیسے پاس ہوتے اسی مناسبت کی شراب پیتے۔ اگر کچھ پیسے بچتے تو فقیروں یا بچوں کو بانٹ دیتے تھے۔ کبھی آئندہ کیلئے بچا کر نہیں رکھے۔ ان کو یقین رہتا تھا کہ خدا آئندہ کا انتظام کردے گا اور وہ ہمیشہ کرتا تھا۔ چونکہ وہ ہمیشہ بہت کم پیسے مانگتے تھے اس لئے احباب میں سے کسی کو دینے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا۔

اکثر جگر صاحب نے شراب کے لئے اپنے پاس کی چیزیں تک بیچ دی ہیں حتیٰ کہ ریل کا ٹکٹ تک بیچ کر شراب پی لی۔ پانوں کی ڈبیہ۔ سگریٹ کیس کا فوراً نمبر آجاتا تھا جب کوئی چیز بیچنے کو نہ ہوتی تو احباب سے وصول کیا جاتا

شروع ہوتی۔ شراب کے زمانے میں بعض صحاب جگر صاحب سے گھبراتے اور بچتے تھے۔ جگر ان کی اس کمزوری سے واقف تھے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ایسے لوگ جگر سے پیچھا چھڑانے کے لئے انھیں جلدی سے پیسے دیدیا کرتے تھے۔ بعض احباب اس خیال سے دیتے تھے کہ اتنا اچھا شاعر صرف ایک روپیہ مانگ رہا ہے، اب اسے کیا انکار کیا جائے۔ بعض حضرات خود شامل ہونے کے خیال سے ان کو پیسے دیکر شراب منگواتے، خود بھی پیتے انھیں بھی پلاتے تھے۔ بعض تواضع کے طور پر انھیں شراب پیش کرتے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنکو یہ غلط فہمی تھی کہ جگر شراب پی کر خوب سناتے ہیں۔ وہ ان سے شعر سننے کی خاطر انھیں پلاتے تھے۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ جگر صاحب کا میرے یہاں قیام ہے، پینے سے پرہیز ہے۔ میں بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ احباب کو سخت تاکید ہے کہ جگر صاحب جو منگائیں وہ لاکر دیدینا مگر پیسے ہرگز نہ دینا ورنہ یہ شراب پینا شروع کر دیں گے۔ پھر دو ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ جگر صاحب خوب پیئے ہوئے ہنستے چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی فرمانے لگے "کہیئے کوتوال صاحب حکم تھا کوئی مجھے پیسے نہ دے۔ پھر روک نہ لی میری شراب۔ ارے تم میرے خدا سے مقابلہ کرتے ہو جو بڑا رحیم و کریم ہے۔"

خط وکتابت | جگر صاحب خط وکتابت کے بڑے چور ہیں۔ صاحباب کے

خط آتے ہیں وہ ان کے ذہن میں بھی رہتے ہیں لیکن تمام جوابات "آج کل آجکل" کی نذر ہو جاتے ہیں اور کسی کو اس کے خط کا جواب نہیں ملتا۔ وہ اپنی غزلیں نقل کرنے کے علاوہ کچھ اور زیادہ لکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ غزل کی طرح کے اشارے ان کے خطوط میں بھی ہوتے ہیں اور عبارت عام طور پر بے ربط ہوتی ہے۔ ان کے خط کی شان یہ ہے کہ پہلے آدھے صفحے پر متن میں کچھ لکھا پھر حاشیہ پر، پھر اس خط کے چاروں طرف جہاں کوئی جگہ خالی دیکھی ایک جملہ لکھ دیا۔ یہ بھی جب کبھی رات میں فرصت ملی تو کسی کو چند سطریں گھسیٹ دیں ورنہ ملنے پر عموماً معذرت کر دیتے ہیں۔ ان کے خطوں میں عموماً اپنی صحت اور امراض کا دکھڑا ہوتا ہے۔ کسی ادبی مسئلہ پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔

نثر نگاری جگر صاحب نثر نگار نہیں ہیں۔ انھیں نثر لکھنے کا بالکل ملکہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں جس میں ہلکے پھلکے اشارے کئے جاتے ہیں۔ شرح و بسط سے کام نہیں لیا جاتا۔ حالانکہ نثر لکھنے میں تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جگر صاحب کی زندگی کے ہر پہلو میں غزل کا انداز یعنی اشارات سے کام لینا اور شرح و تفصیل سے گریز کرنا بالکل رچ گیا ہے اس لئے نثر لکھنے میں وہ قطعی ناکام رہتے ہیں۔ جب کبھی وہ کوئی مضمون یا تحریر لکھتے بھی ہیں تو وہ ایک ادبی معمّہ بنکر رہ جاتی ہے۔ چند سطور میں وہ اپنے خیالات اس اجمال سے درج کرتے ہیں کہ ان کا مافی الضمیر بغیر کافی غور کے واضح

برادرم ! سلام و رحمت،

میں اب بستر مرض پر ہوں ۔ حسبِ وعدہ آپ کی ماہ [illegible]

ہر حال اب افاقہ ہے، البتہ اس سے کچھ زیادہ زمانہ لگ گیا

مگر طبیعت [illegible] ناسازی ہے، [illegible]

سکا [illegible] کتاب ان [illegible] ۔ آپ کا [illegible]

[illegible] آپ [illegible] خدا [illegible] سلامت رکھیں اور [illegible]

دعا ہے [illegible]

مجبور ہیں [illegible] آپ کو تفصیلاً [illegible]

اور محمود [illegible] ہے ۔ [illegible]

انشاء اللہ [illegible] ۔

سب [illegible] کو بہت [illegible] اور

[illegible] سلام ۔

نہیں ہو سکتا لیکن وہ اپنے طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا سب لکھدیا ہے اور بڑی بات کہدی ہے۔ اس کے بعد خیال آفرینی کا زور ختم ہو جاتا ہے اور آگے گاڑی نہیں چلتی ہے۔

ویسے میرا خیال ہے کہ جگر صاحب نے دو ایک بار کسی رسالے میں چند مضامین لکھے ہیں مثلاً رسالہ بہارستان میں ایک مرتبہ ان کا مضمون "ہیں اور تو" شائع ہوا تھا۔ ممکن ہے اور مضامین بھی لکھے ہوں جو میرے علم میں نہیں ہیں[1]۔

بعض احباب کے اصرار پر اکثر جگر صاحب نے ان کے کلام پر دیباچے ضرور لکھے ہیں۔ جگر صاحب کی آنکھ میں بہت مروّت ہے اس لئے عموماً جو دیباچے انھوں نے لکھے ہیں وہ زیادہ تر تالیفِ قلب پر مبنی ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جن حضرات کے کلام کے متعلق جگر صاحب کوئی اعلیٰ رائے رکھتے ہیں انہی کے کلام پر وہ دیباچہ لکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ویسے عموماً ٹال جاتے ہیں۔ صرف ایک دیباچہ ایسا ہے جو خود انھوں نے اپنی طبیعت اور اندرونی تقاضے کے ماتحت لکھا ہے اور وہ باقیات فانی، مطبوعہ آگرہ پر تبصرہ ہے جو کتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

---

[1] قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اگر ان کے علم میں جگر صاحب کی کوئی نثر کی تحریر ہو تو مجھے کم از کم مطلع ضرور کریں اور اگر ممکن ہو تو مہیا بھی کر دیں۔ میں خصوصیت سے ممنون ہوں گا۔

فانی کے علاوہ حسب ذیل حضرات کے مجموعات کلام پر جگر صاحب نے دیباچے لکھے ہیں۔

۱- محمود اعظم فہمی ترمذی بھوپالی۔

۲- احمد اللہ خاں شاکی شاہجہاں پوری

۳- طالب باغپتی

۴- بیخبر بلند شہری

۵- ہادی مچھلی شہری

۶- عباس کانپوری

ان میں سے پہلے دو میرے پاس ہیں۔ آخر کے چار میرے پاس نہیں ہیں[۱]۔

نذرانہ جگر صاحب شروع میں کیا بلکہ اپنے مین پوری کے قیام تک مشاعروں میں بلا نذرانہ شریک ہوا کرتے تھے اور شائقین انھیں جگہ جگہ کھینچ لے جاتے تھے۔ گویا جگر صاحب کی حیثیت ایک فٹ بال کی سی تھی۔ جو میدان میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھینکا جاتا رہتا ہے۔ مشاعروں میں نذرانہ قبول کرنے کو وہ شعر بیچنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس کے بعد دیکھتے دیکھتے ہماری تہذیبی اقدار نے پلٹا لیا اور مشاعروں پر ٹکٹ لگنا شروع ہو گیا۔ مشاعرے خواص کے بجائے عوام کے مذاق کے لئے ہونے لگے اور بڑھتے بڑھتے اسے

[۱] اگر کوئی صاحب ان کتابوں کا ایک ایک نسخہ مجھے ارسال فرما سکیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔

کارکنان نے تجارت کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ جگرؔ صاحب ایک طرف تو اپنی اس کھینچا تانی سے عاجز آ گئے تھے، دوسری طرف مشاعروں کے اس تجارتی پہلو یعنی ٹکٹ سے وصول یابی کرنے کے اصول کے پیش نظر انھوں نے اپنی رائے میں ترمیم کی اور اخبارات میں یہ اعلان شائع کرایا کہ آئندہ جو صاحب کسی مشاعرے میں مجھے مدعو کریں وہ جامعہ ملیہ دہلی کو پچاس روپیہ بطور چندہ منی آرڈر کر کے رسید دعوت نامہ کے ساتھ مجھے بھیجا کریں یا خود ساتھ لایا کریں۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا مجبور ہو کر جگرؔ صاحب نے اپنی مشاعرے کی شرکت کی فیس مقرر کر دی اور اس پر سختی سے عامل ہو گئے۔ لیکن اب بھی وہ ایسے مشاعروں میں جن میں ٹکٹ نہیں لگایا جاتا بالخصوص اسکولوں اور کالجوں کے مشاعروں میں بلا فیس شریک ہو جایا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نذرانہ وصول کرنے میں جگرؔ صاحب کا مقصد اتنا زیادہ آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنا نہیں ہے جتنا تقاضوں کو محدود کرنا ہے۔ بہرحال ان کا فیس مقرر کرنا مشاعروں کے تجارتی پہلو کا ایک فطری ردِ عمل ہے۔ غرض شروع میں جگرؔ صاحب کا نذرانہ سو روپیہ یا دو سو روپیہ ہوتا تھا لیکن اب وہ سفر خرچ کے علاوہ پانچ سو سے کم قبول نہیں کرتے۔

آمدنی آگرہ تک عینک فروشی سے جگرؔ صاحب کی ذاتی آمدنی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب آپ کے ذہن پر آپ کی محبوبہ کی مفارقت دائمی نے کافی اثر ڈالا تو آپ نے یہ تجارت وغیرہ سب ترک کر دی۔ اس کے بعد سے

حضرت اصغر گونڈوی۔ شیخ اصغر حسین وکیل مین پوری اور نواب علی حسن خاں لکھنؤ کے سلوک محبت کے علاوہ آپ کی کوئی ذاتی آمدنی نہیں رہی البتہ لکھنؤ کے قیام کے آخری زمانے میں نواب بھوپال کے بھتیجے (نواب زادہ رشید الظفر خاں) نے آپ کا ایک صد روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا جس پر دربار داری کی کوئی قید نہ تھی۔ نہ کوئی اور شرط تھی۔ اس کے بعد جگر نے شراب ترک کی اور آخری شادی کی، پھر تو خدا کی طرف سے آپ پر دولت کے دروازے کھل گئے اور اس افراط سے آپ پر روپیہ برسنے لگا کہ داغ، جوش اور حفیظ کے علاوہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کو ایسے مواقع کم نصیب ہوئے ہیں۔ ان تینوں کو بھی کسی نہ کسی ملازمت میں یہ موقعے ملے لیکن جگر صاحب نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ بہر حال ایک بات میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جگر نے پیسہ حاصل کرنے میں کبھی حرص سے کام نہیں لیا۔ نہ روپیہ حاصل کرنیکے سلسلہ میں اپنے اور شاعری کے وقار کو کبھی صدمہ پہنچایا اور نہ کبھی روپیہ خرچ کرنے میں احتیاط برتی۔ جس افراط سے ان کے پاس روپیہ آتا تھا اسی طرح دونوں مٹھیاں بھر کر اسے خرچ کرتے یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پھینکتے تھے اور اس سلسلہ میں اپنے حاجتمند احباب کو بھی انھوں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ انھیں احباب کے لئے تحفے خرید کر لانے کا خاص شوق ہے۔ جگر صاحب کو شروع میں تو صرف مشاعروں سے نذرانے کی آمدنی ہونے لگی اس کے بعد دیگر ذرائع

مثلاً ریڈیو، گراموفون۔ فلم وغیرہ پیدا ہو گئے۔

ہندوستان میں صنعت فلم سازی کا زور ہوا۔ ہمارے ادیب اور شاعر اور دوسرے ممالک کے ادیب اور شعرا بھی چونکہ عموماً مفلس ہوتے ہیں اور چونکہ اس صنعت میں فراخ دلی سے روپیہ ملتا ہے اس لئے یہ لوگ ٹوٹ کر اس طرف گرے۔ اپنے کسی ادیب یا شاعر پر ہم کوئی اعتراض نہیں کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ منشی پریم چند۔ آرزوؔ لکھنوی۔ جوشؔ ملیح آبادی۔ ساغرؔ نظامی۔ کرشن چندر۔ سعادت حسن منٹو۔ شکیلؔ بدایونی جیسے مشہور شعرا اور ادیب فلم سے منسلک ہو گئے لیکن فلم سازوں کی انتہائی کوشش کے باوجود جگرؔ صاحب فلمی جال سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ صرف ایک مرتبہ فلمی مشاعرے کی تمثیل میں داغؔ کا پارٹ ادا کرنے کے سلسلے میں ضرور گرفتار ہو گئے۔ ہوا یہ کہ جب ایک فلم ساز[1] نے آپکو یہ پیش کش کی تو ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جو رقم آپ لینا چاہیں تار سے مطلع کر دیں۔

آپ نے صاف صاف انکار کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ اتنی زیادہ رقم مانگی جائے جسے فلم ساز منظور نہ کر سکیں۔ انھیں اس وقت تک فلمی صنعت کے معاوضوں کی ادائی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے

---

[1] کراچی کے ایک جلسہ میں جگر صاحب کے ایک دوست فضلی صاحب نے یہ تذکرہ کیا کہ یہ صاحب وہ خود تھے کوئی فلم ساز نہ تھا اور یہ ان کی جگر صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔

اپنی نظر میں ایک بڑی رقم طے کر کے تار دیدیا۔ فوراً جواب آیا کہ منظور ہے فلاں تاریخ کو اسٹوڈیو پہنچ جائیے۔ اب جگر صاحب کے سامنے جانیکے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ایفائے وعدہ کے سختی سے پابند ہیں۔ لہٰذا طوعاً وکرہاً وہاں جانا پڑا اور فلم جوزنگی میں آپ کو داغ کی حیثیت سے فلمایا گیا۔

جگر صاحب کو درباداری سے ہمیشہ وحشت ہوتی ہے اس لئے وہ رؤسا کے یہاں کی حاضری سے بھاگتے ہیں۔ ایک دفعہ نواب معظم جاہ بہادر (دکن) نے آپ کو اپنے دیوان کی ترتیب اور نظر ثانی کے لئے مقرر فرمایا۔ اور آپ پر سے آداب دربار کی بہت سی پابندیاں اُٹھالیں لیکن اس کے باوجود آپ چند دن ان کے یہاں رہ کر بہ لطایف وہاں سے چلے آئے۔

عدم ہجرت پاکستان | جگر صاحب پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر کے یہاں نہیں آئے اور برابر گونڈے ہی میں مقیم رہے۔ بارہا سجا سجایا بنگلہ اور موٹر پیش کی گئی۔ چند صد روپیہ ماہانہ مقرر کرنے کا وعدہ کیا گیا لیکن جگر صاحب پاکستان آنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ ہمیشہ انھوں نے یہی جواب دیا کہ جب تک بھارت کی حکومت اپنے برتاؤ سے مجھے ہجرت کرنے پر مجبور نہ کردے میں یہاں آنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ اگر سب مقتدر مسلمان بھارت چھوڑنے لگیں تو بتائیے وہاں کے عام مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرے گی اور وہ کس کے سہارے وہاں زندگی گزار سکیں گے۔

ان کے رویہ کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں انھوں نے بھارت کے متعلق کبھی زہر نہیں اُگلا نہ بُرا بھلا کہا۔اس کے برعکس انھوں نے کبھی بھارت کے ساتھ خوشامدانہ پالیسی بھی اختیار نہیں کی۔کبھی کشمیر کے خیر سگالی مشاعروں میں شریک نہیں ہوئے بلکہ ہندوستان میں رہتے ہوئے "بھاگ مسافر بھاگ" والی نظم تک کہہ گزرے۔جگر صاحب سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ نہ کبھی وہ پاکستان میں کوئی سیاسی گفت گو کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی میں نے ان کو پاکستان کے حالات پر سخت ترین ہمدردانہ تنقید کرتے سنا ہے۔جنرل ایوب کے دور کے بعد سے ان کا یہاں آنا ہی نہیں ہوا ہے۔ان کی مقبولیت اور تعلقات ہندو اور مسلمان دونوں سے یکساں ہیں اور انھیں اپنے رویّہ پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ پاکستان آنے کو تیار نہیں۔

مذہب جگر مذہب کے فرقوں کے لحاظ سے حنفی سُنّی المذہب ہیں۔ پہلے شیعہ تھے۔خود اسے ترک کر کے سنّی عقیدہ اختیار کیا۔مذہب کے عقائد کے معاملہ میں وہ سخت ہیں لیکن اعمال مثلاً نماز روزہ کے معاملہ میں بے عمل ہیں نماز کبھی کبھی پڑھتے ہیں لیکن جب پڑھتے ہیں بڑی احتیاط اور انتہائی پاکیزگی کا خیال رکھ کر۔اکثر کئی کئی دن متواتر پڑھتے رہتے ہیں اور بظاہر ان میں پورا خضوع خشوع ہوتا ہے۔پھر ترک ہو جاتی ہے۔روزہ میں بہت کمزور ہیں افطار سے کوئی آدھ گھنٹے پہلے سگریٹ جلا کر ٹہلنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ افطار تک چار پانچ سگریٹ یونہی جل کر بجھ جاتے ہیں۔

نواب علی حسن خاں کی صحبت کے بعد سے وہ مسلمانوں میں اصلاحی تحریک کے علماء کے طبقہ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اب بدعتوں کے سخت مخالف ہیں۔

یہاں ایک واقعہ لکھنا مناسب ہے جس کے راوی اصطفا خاں صاحب ہیں۔ موصوف بہت متدین بزرگ ہیں اور جگر صاحب کے خاص دوستوں میں ہیں۔ تقریباً ہر سال حج کا شرف حاصل کرتے ہیں اور مدینہ منورہ میں ان کا ایک مکان اصطفا منزل ہے۔

انھوں نے بیان کیا مدینہ منورہ کے ایک بزرگ مولوی عبدالوہاب انصاری نے ایک سال خواب میں دیکھا کہ جگر گنبد خضرا کے سامنے کھڑے ہیں اور لہک لہک کر اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔ اصطفا خاں صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے کبھی جگر کو دیکھا ہے اور ان کو پڑھتے سنا ہے۔ انھوں نے جواب دیا "کبھی نہیں" اس پر اصطفا خاں نے دریافت کیا "اچھا ذرا حلیہ تو بیان کیجیے" تو انھوں نے فرمایا "پستہ قد، سیاہ رو، بدہیئت، سر کے بال بکھرے ہوئے شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، مست اور لاابالی سے"

یہ واقعہ اصطفا خاں نے جگر سے بیان کیا۔ پھر جب جگر حج کو گئے تو فرمائش کر کے ان صاحب سے ملے اور کچھ دیر بیٹھ کر ان کو اپنا کلام بھی سُنایا

گیت

"ایک آزاد ملک کی قوم کا ایک نووارد مسافر سے پشتو کا خطاب"

بھاگ مسافر میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ
اور اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ

ایسی کچھ اپنے گاندھرتا، اکثر ہیں وہ لوگ
دل ہیں جن کے کنکر پتھر، فطرت جن کی کھاگ

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ

اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

گاندھی جی کا نام زباں پر من کے اندر روگ
کام نہیں ہے جھانسا پٹی، بات نہیں ہے لاگ

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ

جیتا جاگا ننگی بھوکی لوریاں کچھ لوگ
اپنے اپنے محل میں بیٹھے اڑائیں کاگ

بھاگ مسافر، بھاگ مسافر میرے وطن سے بھاگ

میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ

اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

بھولی بھالی صورت والے پہنیں کوٹ
گوری چٹی رنگت والے ناگ ہیں کالے ناگ

بھاگ مسافر بھاگ مسافر بھاگ

[illegible]

کوچے کوچے، گوشے گوشے لوٹ مچی ہے لوٹ
جنگل جنگل، بستی بستی، آگ لگی ہے آگ

آگ لگی ہے آگ مسافر، آگ لگی ہے آگ

بھاگ مسافر بھاگ مسافر بھاگ مسافر بھاگ

میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ

اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

تیرے وطن میں میل محبت، فرض کا عام احساس
میرے وطن میں لوٹ کھسوٹ اور اپنے اپنے بھاگ

بھاگ مسافر میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ

میرے چمن سے بھاگ مسافر میرے وطن سے بھاگ

آزادی کی ہیبت سے ملا۔ آخر کیا انعام
کتنے جاگے پھر دوبارہ سو گئے، موت نے چھیڑا راگ

موت نے چھیڑا راگ مسافر موت نے چھیڑا راگ

بھاگ مسافر بھاگ مسافر بھاگ مسافر بھاگ

میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ

اوپر - اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

[illegible]

۲ مقصد پاکستان ہیں - اسی لئے کہ میں بھارت اور پاکستان دونوں کو مکمل آزاد ملک نہیں سمجھتا -

اس کے بعد ان بزرگ نے فرمایا "واللہ یہی شکل وصورت اور اسی حلیہ کا شخص اسی لہجہ میں کلام سُنا رہا تھا"

حج جگرؔ صاحب نے ۱۹۵۴ء میں حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا جگرؔ صاحب کی ذہنیت اور رجحانات ہمیشہ سے مذہبی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ عاشق رسول بھی ہیں۔ ان کے دل میں حج کی عرصہ سے تمنّا تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اس موقع پر حج کو جانے میں ان سے زیادہ ان کی بیوی کی تمنّا اور اصرار شامل تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ موہانی کو زیارت بیت اللہ سے جو والہانہ شیفتگی پیدا ہو گئی تھی وہ جگرؔ صاحب کے یہاں نہیں ملتی۔ بہرحال یہ معاملہ تو ان کے اور ان کے اللہ کے درمیان ہے۔ البتہ جگرؔ صاحب کا کہنا ہے کہ انھیں حج کے دوران بعض مدارج سے سرفراز فرمایا گیا۔

مقبولیت میرا اندازہ ہے کہ جگرؔ صاحب کو خواص اور عوام میں اس قدر مقبولیت حاصل ہے جتنی شاید موجودہ دور کے کسی شاعر کو حاصل نہیں ہوئی اور یہ مقبولیت صرف ان کے کلام تک محدود نہیں، ان کی ذات بھی اس سے تعلّق رکھتی ہے اور ان کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

داغؔ کے کلام کی مقبولیت عوام تک اور ان کی ذات خواص تک محدود تھی۔ حسرتؔ کا کلام اگرچہ خواص اور عوام دونوں میں مقبول تھا لیکن ترنّم سے نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے اور اپنی فطرت کی ضرورت سے زیادہ سادگی کی وجہ سے

وہ اتنے زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔ اور اصغر۔ فانی۔ اقبال اور جوش چاروں خواص کے شاعر رہے اور ان کی ذات بھی خواص تک محدود رہی لیکن جگر صاحب کی مقبولیت خواص اور عوام کی حدود سے گزر گئی ہے۔ ان کی مقبولیت عام ہے۔ اور ایسی عام کہ اکثر انھیں کہنا پڑتا ہے کہ ع اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی۔

ان کے پاس اعلیٰ عہدیدار۔ بڑے بڑے سرمایہ دار۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات۔ دفتروں کے معمولی کلرک اور ادنیٰ دوکاندار سب گرویدگی کے ساتھ چلے آتے اور ان کو اپنے یہاں بُلا لے جاتے ہیں لیکن جگر صاحب کسی سے گریز نہیں کرتے کرتے ہیں تو ریاکار آدمی سے جس میں خلوص نہ ہو اور بدمذاق ہو۔ نہ وہ کسی سے بددماغی کرتے ہیں۔ اکثر بددماغی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ہے تو بددماغ عہدے دار یا سرمایہ دار کے مقابلہ میں جو جگر صاحب کو محض اپنے تفننِ طبع کا مشغلہ سمجھتے ہیں یا اپنے دربار میں انکی حاضری اپنا حق سمجھتے ہیں۔

رہی ان کے کلام کی مقبولیت۔ اس کا تو یہ حال ہے کہ وہ جس مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں بلا مبالغہ اس کو لوٹ لیتے ہیں۔ لوگوں پر ان کے کلام سے ایک مدہوشی سی طاری ہو جاتی ہے اور بلا ارادہ وہ ایک دم چیخ پڑتے ہیں۔ آج تقریباً تمام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان اور قلم پر ان کے اشعار رہتے ہیں جنھیں وہ تحریر اور تقریر کے دوران بے تکلفانہ استعمال کرتے ہیں سچ ہے

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اعزاز بھارت کی حکومت نے اُردو کے شاعر جگر مرادآبادی کو اعزاز دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ حال میں صدر کا بہت بڑا اعزاز "پدما بھوشن" تفویض کیا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت نے آپ کے آخری دیوان "آتش گل" پر آپ کو پانچ ہزار کا انعام بھی دیا۔ اس کے علاوہ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ مرکزی حکومت نے دو سو روپیہ ماہوار اور یوپی حکومت نے دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی آپ کے لئے مقرر کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی علالت کے زمانے میں آپ کے معالجہ کے لئے بھی کچھ رقم منظور فرمائی۔

پاکستان کی حکومت نے بھی یہاں آنے کی صورت میں بہت کافی امداد کا یقین دلایا اور گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین نے آپ کے اعزاز میں اپنے یہاں خود ایک تقریب مشاعرہ منعقد کی۔

عوام کی جانب سے اعتراف کے سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جہاں سے حال ہی میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ اور بمبئی کی مثال جہاں جشنِ جگر بڑے اہتمام سے منایا گیا۔

مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا اب تک جگر صاحب کی موت کی خبر کم از کم دو مرتبہ اخبارات میں نکل چکی ہے۔ ایک تو غالباً ۱۹۳۵ء میں یہ خبر

بڑے زور شور سے اُڑی۔ تمام اخبارات نے ان کا ماتم کیا۔ بعض نے خاص نمبر نکالے۔ جامع مسجد دہلی میں تعزیتی رزولیوشن پاس ہوا اور اس نے بعد نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔

اس کے کئی دن بعد قرولباغ دہلی میں، میں گھر واپس آرہا تھا دیکھتا کیا ہوں کہ جگر صاحب میرے دروازہ پر کھڑے مجھے آواز دے رہے ہیں پہلے تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یا اللہ! یہ مُراد آباد میں مُردہ کیسے زندہ ہو گیا۔ پھر یکایک دوڑ کر لپٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حواس بجا ہوئے تو دریافت کیا کہ آخر یہ کیا؟ تو بتلایا کہ مراد آباد میں چند احباب شکار کو جا رہے تھے۔ وہ مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ واپسی میں ان کے ساتھ میں واپس نہ آیا۔ ممکن ہے کسی نے مذاق میں کچھ کہہ دیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار اسٹیٹسمین کے نمائندے نے اپنے اخبار کو تار دیدیا اور یوں یہ خبر پھیل گئی۔

اتفاق سے آل انڈیا ریڈیو نے جگر کی یاد میں "جگر ڈے" منانے کا اعلان کیا تھا اور دوسرے دن وہ پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ لہٰذا میں فوراً جگر صاحب کو ساتھ لیکر جامعہ ملیہ کے دفتر گیا اور وہاں سے ریڈیو اسٹیشن ٹیلی فون کیا کہ آپ جگر ڈے منانے والے ہیں اور جگر صاحب زندہ ہیں اور جامعہ ملیہ کے دفتر میں میرے پاس موجود ہیں۔ انھوں نے

حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کو فون دو تاکہ ہم خود بات کر لیں۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ جگر صاحب فون پر کبھی بات نہیں کرتے۔ بہت سمجھایا لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ مجبوراً ان سے یہ معذوری ظاہر کر دی۔ اس پر انھوں نے ہدایت کی کہ آپ جا معہ کے دفتر میں جگر صاحب کو روکے رکھیئے ہم موٹر پر خود آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ریڈیو کے چند افسران وہاں پہنچ گئے اور جب جگر صاحب کو دیکھ کر اطمینان کر لیا اور سب حالات معلوم کر لئے تو اس پر غور شروع ہوا کہ جگر ڈے کا کیا ہو۔ آخر طے پایا کہ جگر ڈے تو بدستور منایا جائے لیکن ان کی موت کے غم کے بجائے ان کی حیاتِ جدید کی خوشی کا اسے رنگ دیدیا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ کیا گیا کہ ابتدا میں میری ایک تقریر ہو جس میں اس واقعہ پر روشنی ڈالی جائے۔ پھر جگر خود اپنی زبان سے اپنا کلام سنائیں۔ اس کے بعد ریڈیو آرٹسٹ جگر صاحب کی نئی نئی اور برمحل غزلیں گاتے رہیں۔ اس کے بعد ہم لوگ آ گئے۔ دہلی میں جیسے جیسے یہ خبر پھیلتی گئی شام تک ملنے والوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ دوسرے روز جگر صاحب اور میں کافی جلوس کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گئے۔

دوسری مرتبہ ابھی ۱۹۵۸ء میں جگر صاحب کی موت کی خبر اڑی تھی بات یہ ہوئی کہ ان پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اسی میں یہ خبر اڑ گئی کہ انکا انتقال ہو گیا۔ پاکستان میں یہ خبر لاہور کے ایک اخبار نے شائع کی تھی۔ اسی سے کراچی کے اخباروں نے نقل کی۔ لاہور میں ایک تعزیتی جلسہ بھی ہوا جس کی صدارت

احسان بن دانش نے کی تھی۔ احباب میں دوڑ دھوپ شروع ہوگئی کیونکہ اب لوگوں کو اس خبر کا یقین نہ آتا تھا۔ بالآخر یہ خبر بھی غلط ثابت ہوئی۔

اس کے بعد شوکت تھانوی نے اخبار جنگ میں ایک مضمون میں لکھا کہ پہلی خبر کے بعد جگر صاحب کی عمر بیس برس بڑھ گئی اور اب اس خبر کے بعد کم از کم بیس برس کے اضافہ کی پھر توقع ہوگئی ہے۔

علالت۔ امراض جگر صاحب کو کھانسی اور معدہ کی شکایات رہتی ہیں۔ وہ مستقل قبض کے مریض ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو کھل کر بھوک نہیں لگتی معدے کی انہی شکایات نے گیس کی تکالیف پیدا کر دی ہیں جس کی وجہ سے زیادہ دور پیدل چلنا ان کے لئے مشکل ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں دل کے پاس سینے میں درد ہونے لگتا ہے۔ قلب کی بیماری خاص ہے جس کے اکثر دورے پڑتے رہتے ہیں سب سے پہلے قلب کا دورہ ان پر ریاست جونا گڑھ میں پڑا تھا اور دوسرا ابھی ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ میں پڑا جس کے بعد سے وہ صاحب فراش اور گونڈہ میں نظر بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ پاکستان نہیں آئے اور وہاں جاکر ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہے۔

چونکہ جگر صاحب کا احساس بہت تیز اور شدید ہے اس لئے انھیں تھوڑی سی تکلیف بھی بہت زیادہ مہیب معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے امراض کا اکثر تذکرہ کیا کرتے ہیں لیکن ۶۵ سے متجاوز عمر میں ایک ایسے شخص کی جس کی

زندگی بے ضابطگیوں کا مجموعہ رہی ہو صحت اور کیا ہو سکتی ہے۔

نشتر اور جگر کی ملاقات شوکت تھانوی نے جنگ میں عبدالرب نشتر صاحب کے سلسلہ میں جگر صاحب کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ چونکہ اس واقعہ سے جگر صاحب کے کردار پر کئی پہلو سے روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے ہم اسے بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

"حضرت جگر مرادآبادی بھارت سے پاکستان آئے ہوئے تھے اور لاہور میں قیام تھا کہ ایک دن ان سے ایک صاحب ملنے کو تشریف لائے نہایت کم سخن سے شرمیلے اور بہت ہی "ہیچمداں" قسم کے مگر جگر صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ ہیچمداں نہیں بلکہ "ہمہ داں" قسم کے بزرگ ہیں اور حیرت ہوگئی یہ سُنکر کہ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہیں حالانکہ صورت سے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی بھی نظر نہ آتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جگر صاحب نے پوچھا کہ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں۔ وہ نہایت بے پروائی سے بولے "محکمۂ آبادکاری میں مُلازم ہُوں۔" روا روی میں تو جگر صاحب نے پان کھاتے ہوئے گردن ہلادی کہ گویا ان کو یہ سُنکر اطمینان ہو گیا کہ برسرِ کار تو ہیں مگر پھر خود ہی چونکے "جی کیا فرمایا۔ محکمۂ آبادکاری، آپ کا کیا تعلق محکمۂ آبادکاری سے۔ صاحب آپ علمی ڈاکٹر ہیں تعلیمات کے ماہر ہیں۔ آپ آبادکاری کے محکمہ میں کیسے چلے گئے۔ آبادکاری ہی کہا تھا نا آپ نے؟" ان صاحب نے بڑے سکون سے فرمایا

"جی ہاں آبادکاری ہی کے محکمہ میں ہوں اسی محکمہ میں ایک جگہ خالی تھی لہٰذا مجھ کو رکھ لیا گیا ہے۔" جگر صاحب نے اور بھی چکرا کر کہا "صاحب یہ کیا بات ہوئی۔ فرض کر لیجیے کہ کسی اسپتال میں کسی نرس کی جگہ خالی ہوتی تو گویا آپ کو نرس بنا دیا جاتا کسی تھانہ پر ایک تھانیدار کی جگہ خالی ہوتی تو آپ تھانیدار بنا دیئے جاتے یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں۔ آخر محکمۂ تعلیم نے آپ کی خدمات سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا"

ان صاحب نے بڑے عجز سے کہا کہ "میرا کوئی اثر ورسوخ محکمۂ تعلیم میں نہیں ہے۔ میری رسائی گورنر تک بھی نہیں جو چانسلر ہیں"

ان کی بات کاٹ کر جگر صاحب نے دوسرے حاضرین محفل کو ڈانٹنا شروع کیا کہ صاحب یہ کیا اندھیر ہے۔ ہرن پر گھاس لادی جا رہی ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ گدھے تو خیر خشکہ کھاتے رہتے ہیں اور میں اس کو انکی خوبیٔ قسمت سمجھتا ہوں۔ مگر ایک پی۔ ایچ۔ ڈی کا محکمہ آبادکاری سے کیا تعلق؟"

جگر صاحب کا یہ سب کچھ زبانی جمع خرچ نہ تھا بلکہ وہ واقعی بے چین تھے۔ وہ سچ مچ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس وقت الکارجی کھیلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ کئی مرتبہ تاش کی گڈی اٹھائی اور پھر یہ کہہ کر رکھ دی کہ "صاحب مناسبت کیا ہے پی۔ ایچ۔ ڈی میں اور محکمہ آبادکاری میں" اور آخر مجھ سے کہا کہ "صاحب آپ مجھے لیکر نشتر صاحب کے پاس چلیے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے جگر صاحب کو سمجھایا کہ نشتر صاحب سے

ملنے کے لئے ان کے سکریٹری سے وقت مقرر کرنا پڑے گا ان سے اس طرح نہیں ملا جا سکتا کہ آپ شیروانی پہنیں اور ان سے ملنے کے لئے ان کے دروازے پر جا کر آواز دے دیں۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ان کے سکریٹری کو ٹیلی فون کئے دیتا ہوں کہ جگر صاحب گورنر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں. جگر صاحب نے بات سمجھتے ہوئے کہا "جی ہاں، جی ہاں۔ وقت مقرر کر لیجئے اور ڈاکٹر صاحب آپ بھی میرے ساتھ ہی چلئے۔" میں نے گورنمنٹ ہاؤس ٹیلی فون کر کے گورنر کے سکریٹری کو جگر صاحب کا پیغام پہنچا دیا اور تھوڑی ہی دیر میں سکریٹری نے مجھ کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دی کہ ہزایکسی لنسی کل سہ پہر کو چار بجے جگر صاحب کو، آپ کو اور ان ڈاکٹر صاحب کو چائے پر مدعو کر رہے ہیں اور آپ صاحبان کا انتظار کریں گے۔ جگر صاحب بظاہر تو مطمئن ہو گئے مگر اس دن رہ رہ کر یہی کہتے رہے کہ صاحب یہ تو کمال ہی ہو گیا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی اور محکمہ آبادکاری میں ملازم۔ یہ خیال ان کو رمی کھیلتے میں بھی آتا رہا اور جب کبھی جوکر نہ آتا تھا، یہ خیال ان کو آجاتا تھا۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر ہم تینوں گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ سکریٹری صاحب نے جو ہمارے منتظر تھے ہم کو گورنمنٹ ہاؤس کی بالائی منزل پر پہنچا دیا۔ جہاں بالکل گھریلو انداز سے نشتر صاحب لٹھے کی شلوار پر ململ کا سفید لمبا کرتہ پہنے ہال کے دروازے ہی پر ہم لوگوں کے منتظر تھے۔ جگر صاحب کو دیکھ کر

اس عقیدے سے بڑھ کر ملے ہیں کہ گویا اس وقت وہ شاعر تھے اور جگر صاحب گورنر۔ بڑے تپاک سے سب کو ملاقاتی کمرے میں لے گئے اور جب تک سب کو بٹھا نہ لیا خود بھی نہ بیٹھے۔ جگر صاحب نے بیٹھتے ہی کہا۔

"ہاں صاحب طبیعت خوش ہوگئی۔ ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں اس سلیقہ سے پان بھی رکھے ہوئے ملیں گے"

نشتر صاحب جلدی سے اٹھے اور پانوں کی کشتی اٹھا کر پیش کرتے ہوئے کہا "مجھے معلوم تھا کہ آپ شوق فرماتے ہیں اور ڈر تھا کہ اس کمی کو محسوس نہ کریں"۔

جگر صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "خیر نہ سہی"۔

مجھ کو تو جگر صاحب کی اداشناسی کا دعویٰ ہے مگر نشتر صاحب اپنی ذہانت سے کام لیکر ایک طرف لپکے مگر شکر ہے کہ ان کے پہنچنے سے پہلے میں اگالدان تک پہنچ چکا تھا ورنہ یہ گورنر شاید اگالدان بھی اٹھا لاتا۔ اب جگر صاحب پان تھوک کر اور پان کھا کر اپنے مخصوص انداز میں گل افشانی فرما رہے تھے کہ

"وہ جو ایک چیز ہوتی ہے۔ جی ہاں۔ بڑی نزاکتیں ہیں۔ اس میں اس تعلّق کا کوئی نام نہیں ہے اور نہ دیکھا جا سکتا ہے وہ تو بس ایک۔ جی ہاں۔ احساسی چیز ہے۔ چنانچہ وہ ہے اور میں نے اس کو ہمیشہ محسوس کیا ہے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ نشتر صاحب کی اس آؤ بھگت اور اس حلم سے متاثر

ہیں اور اس خلوص کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ان کو نشتر صاحب سے ہے مگر خلوص کا نام لینا نہیں چاہتے۔ بس اس کو "ایک چیز" کہہ رہے ہیں۔ نشتر صاحب غور سے ان کی باتیں سُنتے رہے اور اس طرح سمجھنے کی کوشش کرتے رہے جس طرح ہم لوگ تجریدی آرٹ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یا بعض لوگ معمے حل کرنے میں دماغ سوزی سے کام لیتے ہیں۔ اسی وقت اسی کمرے میں چائے لگا دی گئی اور اس کا دور بھی چلتا رہا۔ نشتر صاحب خود اُٹھ کر ایک ایک چیز پیش کرتے رہے اور جگر صاحب کی تو تیمارداری کی حد تک تواضع کرنے میں مصروف رہے۔ آخر چائے کے دور کے بعد خود نشتر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق جگر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی تعریف کیجئے تو جگر صاحب کو جیسے اچانک یاد آگیا کہ ان کے واسطے وہ یہاں آئے ہیں اور ان ہی کا اب تک تعارف نہیں کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی علمی اور تعلیمی صلاحیتوں کی پوری تفصیل میں جا کر گورنر صاحب کو بتایا کہ ان صلاحیتوں کا حامل یہ شخص محکمۂ آبادکاری میں ملازم ہے۔ نشتر صاحب فوراً تہ کو پہنچ ہو گئے اور دو لفظوں میں اس پوری تفصیل کا جواب دیدیا کہ "اب یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں ان کو ان کے صحیح منصب پر پہنچا دوں۔" یہ صرف سرسری اور رسمی وعدہ نہ تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب دو ماہ بعد محکمۂ تعلیم سے وابستہ بھی کر دیئے گئے۔

ذکر تھا نشتر صاحب سے اس ملاقات کا جس میں ابھی چائے کا دور چل رہا تھا۔ چائے کے اس دَور کے بعد ہی نشتر کے ایک صاحبزادے نہایت

ادب سے آکر ایک طرف بیٹھ گئے۔ غالباً ان کو انتظار تھا کہ جگر صاحب سے کچھ سنا بھی جائیگا مگر نشتر صاحب نے آخر تک یہ فرمائش بھی نہ کی اور جگر صاحب کو یہ زحمت بھی نہ دی۔ ہم سب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ....

گورنمنٹ ہاؤس سے رخصت ہو کر جب باہر آ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے اپنے استعجاب کا اظہار کیا۔

"میرے تو ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا کہ اس منصب پر پہنچ کر بھی اخلاقی قدروں کا اتنا لحاظ رکھا جا سکتا ہے"

جگر صاحب نے بڑے پتہ کی بات کہی" جی ہاں، مگر وہ جو ایک چیز ہوتی ہے، وہی راز ہے ان تمام ترقیوں کا عالی ظرفی انسان کو چھلکنے نہیں دیتی"

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے تاثرات پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جگر کے کردار پر روشنی ڈالنے والے چند واقعات ایک مضمون میں لکھے ہیں۔ اسکے اقتباسات پیش ہیں :-

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، مؤدب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف 'ہاں' 'نہیں' میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب کے یہاں ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو اپنی مہم پر چلے جائیں۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اکتایا ہوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سنا دیتے "چاہے جہاں پھرو، لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا۔" اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "اصغر صاحب، کہاں آنا پڑے گا؟ بیچارے آتو جاتے ہیں۔" اصغر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے "ابھی کہاں آئے ہیں، ابھی تو لائے جاتے ہیں۔"

ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرے کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدخط سے معلوم ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے "یہ سب تمھارے شعر نہیں سنتے تمھارا گوشت کھاتے ہیں۔" اصغر صاحب کی آزردگی پر کسی قدر بے ہی کا رنگ چھانے لگا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا "اصغر صاحب آپ تو لکھنوی شاعری کے تشبیہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟" کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خشمگیں لیکن زیادہ حزیں لہجہ میں بولے "یہاں ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جوان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور

یہ جو اسپرٹ ہوتی ہے نہ، وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھ موئے ہو جاتے ہیں تو یکّے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔

کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے۔

"یہ سب جگر صاحب کے لئے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باھر نہ جانے دینا۔"

میرا خیال ہے کہ جگر صاحب کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ ہے وہ غالباً اس سے متعلق ہے جو مجھے اصغر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضعداری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری و مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ ان کا محبوب سے رشتہ کا انداز Centrifusal (مرکز گریز) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں خلل نظر نہیں آتا، اور ان کا کلام اس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و

فکر کے اعتبار سے دور سے دور ہو، وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر و برتر ہوگا جس کے پوزیشن اس کی بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدِنظر رکھنا چاہیئے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے (اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت جتانا ہے) یہاں شراب کے چھوڑنے اور مصیبتوں کے آنے میں سبب اور مسبب کا رشتہ نہیں ہے۔ رشید صدیقی) یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا۔ صحت خراب ہو گئی، طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگر صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا، وہ جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کتنے اور کیسے کیسے "روزِ ابر و شبِ ماہتاب" آئے ہوں گے اور جگر صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہے اسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ ان میں حیا ہے، وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے۔ ان میں غیرت اور حمیت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر تو جھیل جائیں گے، دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ ان کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے۔ تفصیل میں طوالت ہے۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان آزادمنش عورتوں میں، ماں، بہن، بیٹوں میں، عمائد و اکابر کی موجودگی میں، طلبا، اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں۔ گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابلِ گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عفیف و شفیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے محابا نہ ہو گی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں مَیں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں یا تفریحاً کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان پہچان کا کوئی اردو شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانیؔ مرحوم کے جو اس بارے خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

رؤسا اور امراء کے سامنے جگر صاحب حتیٰ الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں لیکن اس طرح کی صحبتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متردد رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناواجب حرکت سرزد ہو جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے یا کئے نہ رہیں گے چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے نواب زادہ رشید الظفر صاحب زمانہ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا

وظیفہ مقرر کردیا تھا اور کسی طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی کہ وہ کیا کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیانِ ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔

ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب جس معاوضہ اور شرط پر چاہیں انکے متوسلین میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے ڈورے ڈالے گئے۔ جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے وظیفہ سے بس بسر اوقات ہو جاتی تھی جب جگر صاحب اس آفر کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے جگر صاحب سے برملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ امارت کا بھی جھلکایا۔ جگر صاحب بے قابو ہو گئے بولے۔

"جناب آپ مجھے اِن داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشید الظفر خاں کے ہاتھوں بک چکا ہوں!"

حاضرین سناٹے میں آ گئے اور جگر صاحب گھر آ گئے۔

جگر صاحب میں مروّت اور وضعداری بہت ہے جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لئے وہ تمام آداب برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم چلے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے۔

جگر صاحب کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے۔ مدّتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی ہے۔ اب بھی خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے اپنی تنگ دستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہے۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ کپڑے اچّھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جسکو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرا لیتا ہے ورنہ وہ خود کہیں کھو آتے ہیں !۔

جگر صاحب جس کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں میں نے غصّہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہ دیکھا۔ حکم چلاتے نہ پایا، نہ اپنی بڑائی کبھی ان کی زبان پر آئی، دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈے نہ کبھی ان کی تشہیر کی ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرتے ہوں ! جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعرا کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سنا سنا کر اسے ادھ موا کر دیں !

خلوت ہو یا جلوت جگر صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا مشاعرہ میں ان کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ ان کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمّت افزائی کا !

جگر صاحب میرے ہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اوّل یہ کہ جگر صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی۔ اس لئے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا مکمّل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگر صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے، چادر، غلاف، تولیہ کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی کو بلوا کر یہ کپڑے اس کے حوالے کروں گا۔

تیسرے یہ کہ جگر صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لئے نائی بلاؤں گا تاکہ وہ جگر صاحب کو نوک پلک سے درست کردے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے عشّاق ان کو علی گڑھ میں گھسیٹے نہ پھریں۔ اور میرے ہاں نہ اپنا کلام ان کو سُنائیں، نہ ان کا کلام خود سُنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کرلیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپئے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر کرتی ہیں۔

دارالکھلاؔ جگر صاحب کی زندگی کا یہ تفریحی واقعہ جس کی حیثیت لطیفے سے زیادہ کچھ نہیں، کافی دلچسپ ہے، اس لئے یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں جگر صاحب بھوپال تشریف لائے اور میرے یہاں کئی مہینے قیام رہا۔ ان کے قیام کے زمانے میں بھوپال کے بعض با ذوق حضرات ان سے روزانہ ملنے آیا کرتے تھے۔ عموماً شب کے نو بجے سب جمع ہو جاتے اور تین بجے صبح تک بیٹھتے۔ روزانہ کی اتنی لمبی نشست سب کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس لئے طے ہوا کہ رات کی نشست میں مختلف آداب وقیود اٹھا دیئے جائیں تاکہ ہر شخص آزادی، آرام اور بے تکلفی سے اپنا وقت گزار سکے۔ اس مقصد کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی جس کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں:-

آج کل دنیا میدان جدال وقتال بنی ہوئی ہے۔ جدھر دیکھو ہلاکتوں، ہولناکیوں اور تباہیوں کا بازار گرم ہے۔ اگر اس کے اسباب پر غائر نظر ڈالی جائے تو پتہ لگے گا کہ یہ سب سرعت رفتار کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں انسان پیدل چلا کرتا تھا۔ پھر معذور لوگوں کے لئے سواری کا رواج ہوا۔ اس کے

لہ مالک رام صاحب نے بھی ایک مضمون نقوش میں لکھا ہے جس میں دارالکھلاؔ کی تفصیلات دی گئی ہے وہ تقریباً سب صحیح ہیں۔

بعد اس کا غلط استعمال ہونے لگا پہلے بیل گاڑی رائج ہوئی۔ اس کی جگہ گھوڑا گاڑی نے لی۔ پھر تو بھاپ اور بجلی سے چلنے والی سواریاں تابڑ توڑ میدان میں آ گئیں۔ بائیسکل نے موٹر کار کی صورت اختیار کر لی۔ ریل دوڑنے لگی۔ سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے جہاز اور ہوا کے پروں پر اڑتے ہوئے ہوائی جہاز اڑنے لگے۔ حتیٰ کہ اب تو یہ آسانی سے ممکن ہو گیا کہ صبح کا ناشتہ ہم دہلی میں کریں تو دوپہر کا کھانا ہم تہران میں کھائیں۔ پرانے زمانے میں اگر کوئی غنیم حملہ کرتا تھا تو منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے اسے کم از کم ایک ماہ ضرور لگ جاتا تھا اس اثنا میں جس ملک پر حملہ ہونے والا ہوتا تھا اسے تیاری کا کافی موقع مل جاتا تھا لیکن آج تو یہ حال ہے کہ صبح ۵ بجے الٹی میٹم دیا اور ۸ بجے ملک پر بمباری شروع ہو گئی۔ یہ سب سرعتِ رفتار کا کرشمہ ہے۔ لہٰذا امن پسند لوگوں کو اس کے سدِباب کے لئے سکون کی اشاعت یعنی کاہلی کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم امن پسند باشندگانِ عالم انجمن الکھلا کے نام سے ایک انجمن بناتے ہیں۔ اس کا اجلاس روزانہ ۹ بجے شب سے ۲ بجے صبح تک ہوا کرے گا۔ یہ اجلاس اسی کمرہ میں ہوا کرے گا جس میں جگر صاحب کا آج کل قیام ہے (میں اس زمانہ میں بھوپال کے محلہ مسجد شریف خاں میں حفیظ میاں کے مکان میں رہتا تھا۔ جگر صاحب کا اس کے دیوان خانہ میں قیام تھا) اور اسے دار الکھلاء کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس انجمن کی

فیس ممبری ایک عدد تکیہ ہوگی جو ہر ممبر اپنے مکان سے لا کر دارالکاہلا میں ڈالدیگا پھر یہاں سب ممبر روزانہ شب میں جمع ہوں گے اور لیٹ کر داد کاہلی دیا کرینگے چونکہ کاہلی کے معنی خواب غفلت کے نہیں بلکہ بیداری میں بے عملی کے ہیں۔ اس لئے دورانِ اجلاس سونا ممنوع ہوگا۔ اجلاس میں چند سیکنڈ کے لئے ہر شخص کھڑا ہو سکتا ہے یا پھر لیٹ سکتا ہے۔ بیٹھنا سخت جرم متصور ہوگا اور جس کسی رُکن سے یہ جرم سرزد ہوگا اسے سزا کے طور پر تمام ممبروں کی خدمت کرنا ہوگی۔ ان کی دیر کی رُکی ہوئی ضرورتیں پوری کرنا ہوں گی یعنی انکی فرمائشیں پوری کرنا ہوں گی۔ مثلاً پانی پلا دینا۔ پان بنا کر کھلانا۔ اگالدان اٹھا کر دینا۔ چلم بھر کر لانا وغیرہ وغیرہ۔

خیال نہیں پڑتا کہ کبھی کسی ممبر کو اس جرم کے سلسلہ میں یہ سزا بھگتنا پڑی ہو۔ کیوں کہ تمام ممبران تھے ہی ایسے ضابطہ کے پابند۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ اجلاس کے دوران ایک رکن لیٹے لیٹے حقّہ پی رہے تھے۔ اتّفاق سے کسی کا ہاتھ لگا اور انگاروں سے بھری ہوئی چلم ان کے سینے پر لوٹ پڑی۔ وہ نہ اُٹھ کر بیٹھے۔ نہ گھبرائے۔ اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے ایک طرف کو سرک کر کروٹ لے لی۔ سارے انگارے نیچے جا گرے۔

غرض اس اجلاس کا یہ طریقہ تھا کہ ممبران تشریف لاتے اجلاس میں کھڑے ہو کر اپنے بدن کو تولتے اور ویسے ہی کھڑے کھڑے دھڑ سے لیٹ جاتے

حاضری کے تمام ممبر نہایت سختی سے پابند تھے۔ بارش ہو، آندھی ہو، طوفان آئے، کچھ ہو جائے مگر ممبران اجلاس کی شرکت ضرور کرتے۔ بھوپال میں بارش کا اوسط ۶۰ انچ ہے۔ بارش کا عین زمانہ ہے اور پانی موسلا دھار برس رہا ہے لیکن نو بجتے ہی ممبران برساتیاں اوڑھے، چھتریاں لگائے، چھپ چھپ کرتے چوہا نبے چلے آرہے ہیں۔

اس انجمن کے صرف چار عہدہ دار تھے اور انھیں کاہلی کا اعلیٰ سے اعلیٰ ثبوت دینے کے بعد منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے صدر خود جگر صاحب تھے۔ جنھیں صدر الکاہلا کا خطاب تھا۔ جگر صاحب اس وجہ سے صدر منتخب نہیں ہوئے تھے کہ وہ کوئی بڑے شاعر ہیں بلکہ ان کا بھی کاہلی میں امتحان لیا گیا اور جب کاہل[1] ثابت ہو گئے تب انھیں یہ عہدۂ جلیلہ تفویض کیا گیا تھا۔ ان کے نائب حسرت لکھنوی[2] تھے۔ انجمن کا ناظم مجھے منتخب کیا گیا تھا اور ناظم الکاہلا[3] کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ غلام حسنین خاں عزم بنارسی کو نقیب الکاہلا[4] یا "Seargent at arms" منتخب کیا گیا تھا۔ یہ صاحب سپاہیانہ جسم اور قد و قامت کے مالک اور خوب پاٹ دار آواز رکھتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ صدر کے احکام یا انجمن کے اعلانات بآواز دھرا دیں تاکہ سب مطلع ہو جائیں۔

مذکورۂ بالا چار عہدہ داران کے علاوہ تقریباً ۲۱ ممبران اور تھے جو شہر کے مقتدر اور تعلیم یافتہ حضرات میں کے منتخب لوگ تھے جن میں سے ہر ایک کو

اپنی ذاتی خصوصیات کی بنا پر ایک ایک خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔

۵۔ اُمّ الکہلا۔ محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال

(یہ خطاب انکی مادرانہ شفقت کیوجہ سے تھا)

۶۔ فِتنۃ الکہلا ۔ محمود اعظم فہمی ترمذی بھوپالی

(چھوٹے سے قد اور بڑے اچھے شاعر ہونیکی مناسبت سے)

۷۔ دبیز الکہلا۔ محمد عبد الباسط باسط بھوپالی

(دوہرے جسم کی مناسبت سے)

۸۔ قبۃ الکہلا۔ محمد شریف خاں فکری بھوپالی

(قبہ نما توند کی مناسبت سے)

۹۔ طویل الکہلا۔ شاکر علی خاں۔ حال مزدور لیڈر بھوپال

(اپنی طوالت اور بھولی سادہ حرکتوں کی بنا پر)

۱۰۔ قند الکہلا۔ محمد اشرف، اڈیٹر نئی روشنی، کراچی

(چائے میں بہت زیادہ شکر کھانے کی وجہ سے)

۱۱۔ ملیح الکہلا۔ باسط کے بھائی تھے۔ انتقال ہو گیا۔

(ملیح رنگ اور صورت کی وجہ سے)

۱۲۔ صبیح الکہلا۔ افسر الاطبا کے پوتے تھے۔

(صبیح رنگ ہونے کی وجہ سے)

۱۳؎ خطاب یاد نہیں ۔ محمد احمد مکّی

۱۴؎ خطاب یاد نہیں ۔ محمد کریم ذکی بھوپالی

۱۵؎ 〃 احمد اللہ خاں شاکی شاہجہاںپوری سپرنٹنڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی۔

۱۶؎ 〃 سیّد علی اکبر کاظمی۔ سپرنٹنڈنٹ صحت عامہ، تعلیمات۔

۱۷؎ 〃 منظور حسین سرخوش بھوپالی

۱۸؎ 〃 محمد صغیر شعری بھوپالی

۱۹؎ 〃 ذوالفقار علی خاں، شاہجہاںپوری

۲۰؎ 〃 سیّد حسن عبداللہ زیدی۔ پاکستان کی فوج سے حال میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

۲۱؎ 〃 سیّد احمد ولی شاہجہاںپوری

۲۲؎ تا ۲۵؎ نام یاد نہیں۔ صورتیں یاد ہیں۔

چونکہ پورا خطاب زبان سے ادا کرنے میں زبان کی کاہلی کو صدمہ پہنچتا تھا اس لئے ان کا مخفف مثلاً صدرُل۔ قُندَل وغیرہ رائج تھا۔

اس انجمن کی کوئی خاص سرگرمیاں نہ تھیں۔ سرگرمی کے معنی ہیں عمل کے اور عمل و کاہلی میں تضاد ہے۔ البتہ بعض اوقات تفریحات ضرور ہوتی تھیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی ممبر تجویز پیش کرتا کہ اس وقت شاعری ہو جائے

یا شطرنج، تاش، یا کیرم ہو یا چائے پی جائے ۔ صدر تمام ممبروں کا ایما معلوم کر کے فیصلہ کا اعلان کر دیتے پھر اس پر عمل شروع ہو جاتا ۔

انجمن کی تفریحات میں ایک تفریح اجتماعی کھانا بھی تھا ۔ یوں تو اکثر قریب رہنے والے ممبران روزانہ اپنے اپنے گھر سے کھانا لیکر آجاتے تھے اور جگر صاحب کے ساتھ ہی کھاتے تھے لیکن کبھی کبھی یہ اجتماعی کھانا لازمی ہوتا تھا ۔

یہ پہلے سے معلوم کر لیا گیا تھا کہ کس ممبر کے یہاں کون سی چیز اچھی پکتی ہے ۔ بس اس کے ذمّہ مقرر تھا کہ جب اجتماعی کھانے کا اعلان کیا جائے تو یہ ممبر وہی سی چیز جو اس کے یہاں اچھی پکتی ہے اس کے ذمّہ مقرر کر دی گئی ہے صرف دو افراد کے لائق لیکر دارالکہلا پہنچ جائے ۔ دو افراد سے زیادہ کھانا لانا یا مقررہ کھانے کے علاوہ کوئی چیز لانا جرم تھا ۔ اور کبھی کسی ممبر نے اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کی ۔ چیزوں میں کچھ اعلیٰ کھانوں پر منحصر نہیں بلکہ کریلے ۔ ماش کی دال اور کڑھی تک شامل تھی ۔ ان میں میٹھے اور نمکین سب کھانے ہوتے تھے ۔ ہر شخص اپنے ذمّہ کا کھانا میرے مکان کے زنانے دروازے سے پہنچا دیا کرتا تھا ۔ اس طرح پچیس ممبران کے یہاں سے پچاس افراد کا کھانا جمع ہو جاتا تھا ۔ کچھ غیر اراکین بھی مدعو کر لئے جاتے ۔ گھر میں سے کھانا ترتیب دے کر بھیجا جاتا اور باہر سب مل جل کر کھاتے تھے ۔

اس انجمن میں جگر صاحب کو شامل کر کے دس شاعر تھے اس لئے انجمن

کے اجلاس کی فضا عام طور پر شاعرانہ تھی۔ دوسرے شعرا کو سنانے اور داد تحسین وصول کرنے کے خیال سے لوگ زیادہ سے زیادہ غزلیں یا نظمیں کہتے۔ پھر اجلاس میں آکر سناتے۔ جگر صاحب پر بھی اس زمانہ میں شاعری طاری رہتی۔ وہ بھی دوسروں کے مقابلے میں بہتر سے بہتر غزلیں کہنے کی کوشش کرتے۔ نتیجہ یہ کہ جگر صاحب نے بھوپال کے اس قیام کے دوران اتنی قلیل مدت میں جتنی زیادہ تعداد میں اور جتنی اعلیٰ درجہ کی غزلیں کہی ہیں اپنی عمر میں کبھی نہیں کہیں۔ مثلاً ان کی حسب ذیل غزلیں اسی زمانہ کی یادگار ہیں:-

۱۔ جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
۲۔ نظر ملا کے مرے پاس آکے لوٹ لیا۔
۳۔ ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر
۴۔ عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ
۵۔ حُسنِ معنی کی قسم جلوۂ صورت کی قسم
۶۔ دل حریف حال و بے حالی نہیں
۷۔ غمِ عاشقی کا صِلہ چاہتا ہوں
۸۔ محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں
۹۔ جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے
۱۰۔ سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے۔

۱۱ء تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے۔

۱۲ء دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے۔

اس انجمن کے اجلاس کی شرکت کی ممبروں میں کچھ لَت پڑ گئی تھی کہ ہر حال میں کھنچے چلے آرہے ہیں۔ پھر ۳ بجے رات سے پہلے واپس گھر نہیں پہنچتے تو ممبران کی بیویوں میں جو بغاوت پھیلی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ بعض ناواقف بیویوں کا قول تھا کہ ہو نہ ہو جگر کوئی طوائف ہے۔ شاعر ماعر تو باتیں ہیں۔ جب ہی تو مردوے ایسے دیوانے ہو رہے ہیں۔

چونکہ لوگ صدر کو شاعری کے بہانے مدعو کر کے صدر کی کاہلی کو ٹھیس پہنچاتے تھے۔ ادھر باقی تمام ممبران بے صدر کے پڑے رہتے تھے اس لئے یہ قانون بنا دیا گیا کہ صدر چائے یا کھانے کی کسی دعوت میں شریک نہ ہونگے تاوقتیکہ پوری انجمن کو مدعو نہ کیا جائے اور ان کے اجلاس یعنی لیٹنے کا انتظام نہ ہو۔ پھر بھی چند منچلے ایسے نکل ہی آتے تھے جو پوری انجمن کو مدعو کرتے تھے اور سب کے لیٹنے کا بھی انتظام کرتے تھے۔

شب میں ۳ بجے اجلاس بے دودھ کی چائے کے دَور پر جسے پشاور میں قہوہ کہتے ہیں اور جو فنجانوں میں پی جاتی تھی، ختم ہوتا تھا۔

آخر میں صدر کی جُدائی کے وقت محمد عمر خاں فوٹوگرافر، رائل مارکیٹ۔ بھوپال نے پوری انجمن کا ایک یادگار فوٹو بھی لیا تھا۔

لطائف نواب صدیق حسن خاں کی اولاد میں ایک صاحب سیّد ظہورالحسن عرف ظہور میاں بھوپال میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جگر صاحب سے ان کے کافی تعلقات تھے۔ چنانچہ جب کبھی جگر صاحب بھوپال تشریف لاتے وہ ایک دو بار انھیں اپنے یہاں ضرور مدعو کرتے اور ساتھ ہی چند احباب اور بڑے افسروں کو بھی بُلا لیتے۔ کھانے پینے کے بعد پُر لطف صحبت رہتی۔ اور حاضرین جگر صاحب کا کلام سنتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے جگر صاحب کو مدعو کیا اور حسب معمول چند باذوق حضرات کو بلا لیا۔ جگر صاحب اس زمانہ میں سرور میں تھے اور دور جاری تھا لیکن ایسے مدہوش بھی نہ تھے کہ نہ جا سکتے لہٰذا وہ اسی حالت میں ظہور میاں کے یہاں گئے۔ وہاں راجہ اودھ نرائن صاحب جو بعد میں بھوپال کے وزیر اعظم اور "مہر" بھی ہوئے اور دیگر حضرات جن میں چند پنجابی معززین بھی شامل تھے، موجود تھے۔ اس زمانہ میں پنجابیوں کا بھوپال میں کافی اقتدار تھا۔ عام لوگ جگر صاحب سے ملنے آتے تھے برسبیلِ تذکرہ پنجابیوں کے خلاف بہت کچھ کہا کرتے تھے۔ جگر صاحب کے ذہن پر ان لوگوں کی گفت گو کے نقوش باقی رہے۔ چنانچہ جب دعوت کے موقع پر مختلف مسائل پر گفتگو ہونے لگی تو جگر صاحب نے پنجابیوں کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالنا شروع کیا۔ خوب دل کھول کر نہایت بے باکی سے ان کے متعلق ظہارِ رائے کرتے رہے۔ اب ظہور میاں میزبان کی حیثیت سے پریشان کہ کس طرح

جگر صاحب کو روکا جائے ورنہ ان کے پنجابی مہمان بُرا مانیں گے کہ گھر بُلا کر ذلیل کرایا۔ آخر ایک ترکیب اُن کی سمجھ میں آئی۔ ایک مرنجا مرنج قسم کے پنجابی کو حاضرین میں سے منتخب کر کے انھوں نے اس طرح جگر صاحب سے ان کا تعارف کرایا " آپ سے ملئے جگر صاحب۔ آپ ہیں مسٹر حسن محمد حیات پرائیویٹ سکریٹری اعلیٰ حضرت۔ لدھیانہ صوبہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔" جگر صاحب اگرچہ نشے میں تھے لیکن یہ سُنتے ہی انھیں فوراً احساس ہو گیا کہ وہ پنجابیوں کی موجودگی میں ان کی برائیاں کر رہے ہیں۔ فوراً ذرا سنبھلے اور وہیں سے پلٹا کھایا۔ گریز کر کے فرماتے ہیں۔ "جو کچھ پنجابیوں کی بُرائیاں میں نے بیان کیں وہ اگرچہ سب صحیح ہیں لیکن ان میں ایک بڑی خوبی بھی ہے کہ وہ ہندو کش ہوتے ہیں۔" یہ سُنکر سارے مجمع پر جیسے سنّاٹا چھا گیا۔ راجہ صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ لیکن ایک رندِ نیک نیت کا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا۔ غرض ظہور میاں نے جلد ہی چائے پیش کر دی اور اس کے بعد نہایت بے لُطفی سے وہ صحبت ختم ہو گئی۔

(۲)

جگر صاحب دہلی میں میرے یہاں مقیم تھے۔ میرا مکان قرول باغ میں اس سڑک پر تھا جو طبیہ کالج کو جاتی ہے۔ طبیہ کالج میں مشاعرہ ہوا اور جگر صاحب کو اس میں مدعو کیا گیا۔ اگرچہ جگر صاحب کا سرور کا دور تھا لیکن لوگ کہاں چھوڑنے والے تھے۔ پکڑ کر لے گئے۔ مشاعرہ ختم ہونے پر ہم

لوگ جگر صاحب کے ہمراہ پیدل گھر کو روانہ ہوئے۔ ابھی ہم سڑک پر آئے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا کہ ایک بزرگ صورت سے شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے آرہے ہیں۔ سب لوگ رک کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے قریب آکر انتہائی عقیدت سے جگر صاحب سے مصافحہ کیا۔ پھر اپنے ذوقِ ادب و شعر گوئی کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً جگر صاحب سے یہ درخواست کر بیٹھے کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لیجیے۔ یہی نہیں بلکہ جیب سے ایک پرچہ نکال کر وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے کہنے لگے "ایک تازہ غزل ہوئی ہے ملاحظہ کیجیے، مطلع عرض کیا ہے۔" اب وہ مطلع پڑھنے کے لئے کھانس کھنکھا کے حلق صاف کر ہی رہے تھے اور جگر صاحب ہکا بکا ان کا منھ تک رہے تھے کہ ہم لوگوں نے دیکھا۔ جگر صاحب جھک کر اپنا جوتا اُتار رہے ہیں۔ ہم سب حیران کہ خیریت۔ جوتا اُتار کر وہ وہاں سے سیدھی سڑک پر بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب سب ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہیں اور اب ہکا بکا ہونے کی ان حضرت کی باری تھی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا غرض تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے جگر صاحب کے جوتے اُٹھائے اور فکرمند گھر پہنچے کہ نہ جانے ہمارا دیوانہ کدھر نکل گیا ہو۔ گھر عموماً یاد نہیں رہتا ہے۔ غرض گھر پہنچکر جو دیکھتے ہیں تو جگر صاحب اپنے کمرہ میں دروازہ بند کئے دبکے بیٹھے ہیں۔ جب ہم لوگوں نے دروازہ کھولنے کو کہا تو بولے "پہلے یہ بتاؤ، میرا شاگرد تو تمھارے

ساتھ نہیں ہے۔" جب انھیں اطمینان دلا دیا تب کہیں دروازہ کھولا۔

(۳)

ایک شاعر جگر صاحب کے خاص ملنے والوں میں تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ جگر صاحب خوب پیئے ہوئے لیٹے تھے۔ وہ صاحب پاس بیٹھے تھے۔ جگر صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ کچھ شعر سناؤ۔ انھوں نے شعر پڑھنا شروع کیے۔ ایک شعر پر جگر صاحب یکایک اٹھ بیٹھے۔ بڑی عقیدت کے ساتھ پڑھنے لگے " اشہدان لا الہ الا اللہ" پھر پلٹ کر ان سے بپھرے ہوئے انداز میں کہنے لگے "جاؤ اس شعر کو جمعہ کے خطبہ میں شامل کر دو۔" پھر بڑبڑاتے ہوئے میٹھے موڑ کر لیٹ گئے کہ " لوگوں کو عشق کرنا نہیں آتا تو غزل کہنا کیا ضرور" وہ بیچارے خاموش۔ باقی سب بھی بے کیف و بے لطف۔

(۴)

یہ دہلی کا واقعہ ہے۔ جگر صاحب کو شراب پیئے کوئی آٹھ روز گزر چکے تھے اور اب انھیں رہ رہ کے ہڑک اٹھ رہی تھی۔ ہم لوگوں کو اس کا اندازہ تھا۔ لہٰذا ہم نے انھیں بہلانے کا خیال کیا اور ایک دن سہ پہر کو نمائش چلنے کا پروگرام طے ہوا۔ نمائش لال قلعہ کے پاس لگی تھی۔ ہم لوگ مع جگر صاحب روانہ ہوئے اور دریبہ پر اتر گئے۔ ٹریم سے اترتے ہی ایک صاحب نے بڑھکر جگر صاحب سے مصافحہ کیا اور باتیں ہونے لگیں۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی مرادآباد

کے رہنے والے ہیں اور جگر صاحب سے پرانے تعلقات ہیں۔ اس وقت بھی وہ پیے ہوئے تھے۔ خیر۔ آخر میں انھوں نے جگر صاحب کو پینے کی پیش کش کی کہ چلنے ایک دور ہو جائے۔ جگر صاحب نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور فرمایا "کہو بھائی۔ کیا رائے ہے۔" میں نے فوراً کہا "کرنا کیا۔ آپ کو اللہ نے بھیجی ہے تو ضرور پینا چاہیئے"۔ غرضکہ سب لوگ میزبان کے ساتھ روانہ ہوئے اور ایک ہوٹل میں پہنچ کر دَور چلنے لگا۔ جگر صاحب کو کافی سرور ہو گیا تھا لیکن میزبان بُری طرح مدہوش تھے کیوں کہ ان کا یہ دوسرا دور تھا۔ اب انھوں نے اَوْل فول بکنا۔ شور کرنا اور چیزیں پھینکنا شروع کیں۔ یہ دیکھ کر جگر صاحب کچھ پریشان ہو گئے۔ اب صورت یہ تھی کہ وہ شور کر رہے ہیں، گر رہے ہیں اور جگر صاحب انھیں سنبھال رہے ہیں اور ان کو سمجھا رہے ہیں کہ ہوٹل میں ایسا نہیں کرتے۔ ان کا سب نشہ ہرن ہو گیا۔ ہم لوگ چپ بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہیں کہ آج جگر صاحب کو اچھی سزا ملی۔ آخر جگر صاحب نے ان کا بٹوہ اُٹھایا۔ پھینکے ہوئے روپئے سب جمع کئے۔ بل ادا کیا اور میزبان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ان کو سنبھالے ہوئے باہر لائے۔ ایک تانگہ کیا پھر اس پر ان کو سہارا دے کر سوار کیا اور خود ساتھ بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح ان کی قیام گاہ کا پتہ لگایا۔ پھر ہم سے یہ کہہ کر کہ دوسرے تانگہ پر ساتھ آؤ۔ انکی قیام گاہ کی طرف چلے۔ انھیں پہنچا کر پھر ہمارے ساتھ اپنی قیام گاہ پر واپس

آئے۔ راستے میں ہمارے اور ان کے درمیان اس مسئلہ پر کافی اختلاف رہا۔ وہ کہتے تھے کہ "آج کی شراب سے طبیعت بہت بدمزہ ہوئی۔" اور ہم کہتے تھے کہ "آج کی شراب میں سب سے زیادہ لطف آیا۔"

(۵)

ایک مرتبہ بھوپال میں شملہ کوٹھی کا ایک ڈرائیور جو شہرۂ پُشت غنڈا تھا۔ جگر صاحب کو اپنی تفریح کی خاطر لے اُڑا۔ جب تین چار روز گزر گئے تو ہم لوگوں کو فکر ہوئی اور جگر صاحب کو ڈھونڈھنے نکلے۔ اس ڈرائیور کے گھر کا پتہ چلا یا۔ وہاں پہنچے تو جگر صاحب کے شعر پڑھنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ اطمینان ہو گیا کہ حضرت یہاں ہیں لیکن فوراً وہاں جانا مناسب نہ تھا۔ ایک صاحب جگر صاحب کے پرستاروں میں وہاں رہتے تھے۔ پہلے ان کے پاس جا کر سب کیفیت بیان کی انھوں نے فوراً دوڑ دھوپ کر کے محلّے کے بیس پچیس جوان اکٹھے کئے اور انکو اس گھر کے چاروں طرف لگا دیا اور سمجھا دیا کہ ہماری آواز پر دوڑ پڑنا۔ اس کے بعد ایک تانگہ منگا کر اس پر ہم دونوں اس مکان کی طرف چلے۔ تانگہ باہر کھڑا کر کے ہم لوگ مردانے میں داخل ہوئے تو وہاں بہت پُر لطف منظر نظر آیا جگر صاحب اس ڈرائیور اور اس کی والدہ کے ساتھ جو نسلاً فرانسیسی تھی اور جسکی عمر کسی طرح ۷۵ سے کم نہ ہو گی، وہاں بیٹھے شراب نوشی میں مصروف ہیں اور کوئی چوتھا شریک نہ تھا۔ ہمارے "السّلام علیکم" پر تینوں حیرت سے ہمیں

دیکھنے لگے اور جگر صاحب کے تیور سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری مداخلت سخت ناگوار گزری ہے۔ خیر ہم نے جگر صاحب سے چلنے کو کہا تو ڈرائیور سے ردّ و قدح ہونے لگی آخر وہ تن کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا اور نہایت درشتی سے کہا "دیکھیں جگر صاحب کو کون مائی کا لال لیجاتا ہے یہاں سے۔" اِتنا سننا تھا کہ جگر صاحب تڑپ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ڈرائیور کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے "میں چلتا ہوں۔" کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ہم نے انھیں تانگہ میں سوار کیا اور وہاں سے چل دیئے۔ اس وقت جگر صاحب اتنے مدہوش تھے کہ تانگے پر اُلٹے سیدھے لیٹ گئے۔ راستہ میں ان کا ایک جوتا بھی اُتر کر گر پڑا لیکن ہم نے تانگہ روکنا مناسب نہ سمجھا۔

اس واقعہ کا ان کے احباب پر یہ اثر ہوا کہ جگر صاحب مدہوشی کے عالم میں بھی احباب کے وقار کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔

(۶)

جگر صاحب کا دہلی میں میرے یہاں قیام تھا۔ میرے کپڑے بنے تو چند جوڑے جگر صاحب کے لئے بھی بنوائے گئے۔ جگر صاحب پاجامے عموماً علی گڑھ فیشن کے پہنتے ہیں لیکن زیادہ پسند چوڑی دار ہیں۔ چنانچہ ان کے لئے چوڑی دار بنوائے گئے۔ اپنے اور ان کے سب کپڑے درزی کو دیدیئے گئے جس کی دوکان مکان کے بالکل سامنے تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ تقاضے میں سہولت ہو۔ درزی اتفاق سے سکھ تھا۔ جب کپڑے سل کر آئے تو جگر صاحب کے کپڑے انکے صندوق میں رکھ دیئے گئے

ایک دن دوپہر کو میں سو رہا تھا کہ میری بیوی نے جگایا "اٹھو۔ اٹھو۔ جلدی اٹھو۔ جگر صاحب ناراض ہو کر جا رہے ہیں۔" میں گھبرا کر باہر آیا تو دیکھا کہ حضرت بپھرے ہوئے بستر سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ پوچھا کہ خیریت۔ بولے کہ بستر باندھ رہا ہوں۔ میں ایسے بدمذاقوں کے یہاں رہنا نہیں چاہتا جنھوں نے میرے چوڑی دار لکھنوی پاجامے ایک سکھ درزی سے سلوائے۔ حد ہے ایک سکھ درزی اور چوڑی دار پاجامے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ غلطی تسلیم لیکن ابھی اس کی تلافی ہوئی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر میں گھر میں سے بچا ہوا کپڑا اُٹھا لایا۔ ان کے سامنے ڈال دیا اور وہ پاجامے اٹھا لئے اور کہا کہ "یہ میری بیوی رنگ کر پہن لیں گی۔ آپ اس لٹھے کے تھان میں سے دو بہتر بنوا لیجئے" بس غصہ یکایک غائب ہو گیا۔ ہنس دیئے۔ اور میرے ہاتھ میں سے وہ پاجامے لے لئے اور پہن کر بتانے لگے کہ "دیکھو، کیا کیا خرابی ہے۔ خیر تم بھابی کو دیدو کہ وہ یہ خرابیاں دور کر دیں۔" پھر وہی جگر صاحب ہو گئے اور طرح طرح سے اپنی اس حرکت کی معذرت کرنے لگے۔

(۷)

جگر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کا بھوپال میں میرے یہاں قیام تھا مکان کی بالائی منزل ان کے لئے خالی کر دی تھی۔ بالائی منزل میں ایک بڑا کمرہ اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی صحنچی تھی۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی

جو صحنچی میں کھلتی تھی۔ جگر صاحب کا پلنگ کمرے میں کھڑکی کے قریب پڑا تھا اور کھڑکی کے دوسری طرف صحنچی میں ایک اور پلنگ پڑا تھا جو نواڑ سے بنا ہوا تھا اس پر جگر صاحب کا ہولڈال پھیلا ہوا تھا اور اس میں جگر صاحب اور انکی بیوی کے میلے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔

ایک شب جگر صاحب احباب کی صحبت سے اٹھ کر آئے اور اپنے پلنگ پر لیٹ کر سگریٹ سلگا کر پینے لگے۔ بیوی نے ٹوکا "سگریٹ تو پی رہے ہو کہیں کھڑکی سے باہر نہ پھینک دینا۔ ادھر میلے کپڑے رکھے ہیں"۔ غصہ ہو کر آپ نے جواب دیا "ایسا بیوقوف سمجھا ہے تم نے۔ بس ہر قدم پر ناتا لیقی!" وہ بیچاری خاموش ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے جلنے کی بو سونگھتے ہوئے کہا "کپڑا جلنے کی بو آ رہی ہے"۔ بس جگر صاحب فوراً اٹھ کر باہر بھاگے جا کر جو دیکھا تو ہولڈال بری طرح سلگ رہا ہے۔ دوڑ کر اس پر پانی ڈالا پھر جو دیکھا ہولڈال میں جگر صاحب کی قیمتی شیروانیوں، ان کی بیوی کی قیمتی ساڑھیوں میں غرض تمام کپڑوں میں حتیٰ کہ پلنگ کی نواڑ میں تہ بہ تہ تین انچ کے مدور سوراخ ہو گئے ہیں۔ بعد میں اندازہ کیا گیا تو تقریباً پانچ سو روپیہ کا نقصان ہو گیا۔

(۸)

کرنل امیر احمد صاحب بھوپال میں ملٹری سکریٹری تھے۔ جگر صاحب کا شعر گوئی میں انہماک کا واقعہ انھیں کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔

جگر صاحب ان دنوں مراد آباد رہتے تھے اور میں بھی وہیں تھا۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن صبح صبح اٹھ کر جو ان کے یہاں گیا تو معلوم ہوا کہ رات سے کہیں گئے ہیں۔ اب تک غائب ہیں۔ پڑوس میں ایک صاحب کی لکڑیوں کی ٹال تھی وہاں جگر صاحب کی اکثر نشست رہتی تھی۔ سوچا کہ وہاں دیکھتا چلوں۔ جا کر دیکھا تو حضرت ایک پلنگ پر دراز ہیں اور اوپر سے کمبل اوڑھے ہیں۔ پاس جا کر جگایا تو ہوشیار ہو کر فرمایا "ارے بھائی میں بالکل ننگا ہوں۔ پہلے میرے گھر سے ایک جوڑا کپڑا لا دو" غرض میں کپڑے لایا۔ جب انھوں نے پہن لئے تو میں نے کیفیت دریافت کی۔ اس پر فرمایا "بھئی ہوا یہ کہ رات میں میر صاحب کی ٹال پر آیا۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری تھی۔ اس لئے میر صاحب سے کہا کہ مجھے کاغذ پنسل مہیا کردیں اور چراغ۔ حقہ کی تمباکو اور حقہ چھوڑ دیں اور گھر جائیں میں یہیں پلنگ پر لیٹے رہوں گا اور شعر کہوں گا۔ میر صاحب کے جانے کے بعد میں لیٹا حقہ پیتا اور شعر کہتا رہا۔ اس اثنا میں حقہ ختم ہو گیا۔ طلب تو تھی۔ اس کا مہیا نہ ہونا فکر شعر میں مخل ہوتا۔ اس لئے اٹھ کر چلم میں تمباکو بھری۔ اب آگ کی ضرورت ہوئی۔ ذرا غور کیا تو جسم پر ازار بند غیر ضروری چیز محسوس ہوا اسے نکال کر سلگا لیا اور پھر فکر شعر میں ڈوب گیا۔ یہ ضرورت صبح تک کئی مرتبہ محسوس ہوئی اور پہلے کرتہ پھر پاجامہ سب پھاڑ پھاڑ کر حقہ کی نذر کر دیا۔ صبح کے قریب غزل

تیار تھی لیکن میں بالکل ننگا تھا۔ آخر غزل کا پرچہ سرہانے رکھ کر کمبل اوڑھ کر سو گیا ابھی آنکھ لگی تھی کہ تم نے جگا دیا۔" اس پر میں نے کہا "ارے یار ٹال میں بیٹھے رہے اور جلانے کو ملا کرتا پاجامہ۔" بولے "بھئی پہلی بات تو یہ ہے کہ فکر شعر میں اتنی فرصت کب تھی کہ اندھیرے میں چھپٹیاں تلاش کرتا اور دوسرے یہ کہ اب تمہارے کہنے سے مجھے بھی خیال آیا کہ واقعی یہ تو لکڑیوں کی ٹال ہے۔"

(۹)

جگر صاحب شعروں کی داد دینے کے معاملہ میں کبھی کسی کی ہمت شکنی نہیں کرتے تھے لیکن اکثر نشے میں شمشیر بے نیام ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں نشے کی حالت میں شریک تھے۔ ایک صاحب غزل پڑھ رہے تھے جو کچھ یونہی سی تھی۔ جگر صاحب نے باآواز کہا "کیا جھک مارا ہے۔" وہ صاحب بڑے ہوشیار تھے۔ انھوں نے نیم ایستادہ ہو کر جگر صاحب کی خدمت میں تسلیمات عرض کر کے کہا "حضور میں کس قابل ہوں۔ یہ آپ کا ذوقِ نظر ہے۔" بجز قریب کے بیٹھنے والوں کے باقی لوگوں نے جگر صاحب کا فقرہ نہیں سنا تھا۔ انھوں نے سمجھا واقعی داد دے رہے تھے وہ بھی زور زور سے داد دینے لگے۔ اب جگر صاحب کو اور غصہ آیا۔ ذرا اٹھ کر کہنے لگے "میں نے کہا جھک مارا ہے۔ شعر گفتن چہ ضرور۔" وہ شاعر صاحب فوراً ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور لگے تسلیمات کی بوچھار کرنے اور مجمع

ہیں داد کا شور مچ گیا۔ غرض احباب نے جگر کو کھینچ کر بٹھا لیا اور وہ شاعر اسٹیج سے اتر کر جگر کے قریب ہی یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے "بس ..... !"

چند واقعات بعض دیگر حضرات نے بھی تحریر کئے ہیں جنکے اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

شوکت تھانوی

(۱) "جگر سے میں جتنا قریب ہوتا گیا ان کی محبوبیت اسی قدر بے نقاب ہوتی گئی۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا تو ہر ایک معترف تھا اور ہے مگر میں نے ان کے پیکر میں ایک عجیب و غریب انسان پا لیا تھا جو محبت ہی محبت تھا مروت ہی مروت اور شرافت ہی شرافت۔ اس عالمِ رندی و سرمستی میں بھی وہ کبھی انسانیت سے گزرتے نظر نہ آئے۔ مگر بعض اوقات وہ اس اچانک طریقہ پر خطرناک سے خطرناک سچ بول جاتے تھے کہ حاضرین پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کی محفل میں ایک نہایت عالی مقام حاکم بھی کہیں سے آ گئے۔ ان کے سرکاری مرتبہ کا ہر ایک کو خیال تھا مگر شعر و سخن کے معاملے میں وہ نہایت پھوہڑ ثابت ہوئے۔ مثلاً شعر سنکر اظہار پسندیدگی کے طور پر ہنستے تھے اور اچھے سے اچھا شعر ان پر سے اس طرح گزر جاتا تھا جیسے چکنے گھڑے سے بوند پھسل جائے کہ یکایک جگر صاحب کے ایک شعر پر انھوں نے بے ساختہ داد دی اور "ذرا پھر پڑھئے" کہکر گویا اپنے نزدیک

"مکرر ارشاد" کہا تو جگر صاحب نے ان کی جیب میں لگے ہوئے قلم کی طرف اشارہ کرکے کہا "ذرا قلم مرحمت فرمائیے۔ اس شعر کو میں کاٹ دوں۔ اسمیں ضرور کوئی خرابی ہے کہ یہ آپ کو پسند آیا ہے"۔ وہ حضرت کھسیں نکال کر رہ گئے مگر باقی حاضرین کو جیسے سانپ ہی تو سونگھ گیا کہ کس جرأت کیساتھ "توہین عدالت" کی گئی ہے"۔

(۲) "جگر صاحب کی محفل میں ان کے ایک نئے مدّاح تشریف لے آئے اور لگے ان کی تعریفوں کے پل باندھنے کہ آپ کی وہ غزل میں نے اتنے دن گنگنائی ہے اور آپ کی اس غزل نے مجھ کو اتنے دن دیوانہ بنائے رکھا ہے وغیرہ۔ جگر صاحب یہ بدمذاقی کی باتیں سنتے رہے اور دل ہی دل میں الجھتے مگر بظاہر مسکراتے رہے اور "جی ہاں، جی ہاں" کرتے رہے یہانتک کہ ان صاحب نے کہا "جگر صاحب آپ کا ایک شعر ایک جگہ پڑھ کر میں پٹتے پٹتے بچا"۔ جگر صاحب نے نہایت برجستگی سے کہا "افسوس ہے کہ نہایت ناکام شعر ثابت ہوا وہ"، اس فقرے کی بلاغت کو وہ بچارے تو کیا سمجھتے مگر باقی حاضرین ہنس ہنس کر دیوانے ہو گئے۔ اس لئے کہ سب ہی ان صاحب سے جلے ہوئے بیٹھے تھے۔ مگر فوراً ہی جگر صاحب کو غالباً ان صاحب کی دلشکنی کا خیال آیا تو ان سے پوچھا "آپ خود بھی شعر کہتے ہیں؟" وہ واقعی شاعر برآمد ہوئے اور بیٹھ گئے اپنی نہایت پوچ غزل سنانے کہ ان ہی اشعار میں

سے ایک شعر ایسا نکل آیا جو ان محترم کی اوقات سے قطعًا باہر تھا۔ جگر صاحب نے چونک کر کہا "ذرا پھر تو پڑھئے"۔ اور اب جو انھوں نے وہ شعر پڑھا ہے تو جگر صاحب نے نہایت بیساختگی سے کہا "بھئی کس قدر بداعمال تھا یہ شعر کہ آپ پر نازل ہو گیا ہے۔"

(۳) اس برجستگی اور بزلہ سنجی کے ساتھ ہی ساتھ وہ انتہائی سادہ معصوم بلکہ بھولے بھالے بھی تھے پچھلی مرتبہ جب پاکستان آئے تھے تو یہاں کے مشاعروں کی تمام آمدنی کا ایک ڈرافٹ بنوا کر بھارت بھیج دیا مگر واپسی کے لئے پا بہ رکاب ہی تھے۔ ایک اور مشاعرے میں شرکت کرنا پڑی اور وہاں کی رقم کے لئے وہ بیحد پریشان نظر آئے کہ اب اس کو کس طرح لے جائیں۔ کسی نے ان کو مشورہ دیا کہ قمیص کے بٹن وغیرہ بنوا لیجئے۔ چنانچہ آپ نے قمیص کے بٹن بنوا لئے اور اب جو واپس جانے کے لئے کسٹم پوسٹ پر پہنچے تو حسب دستور کسٹم آفیسر نے ان سے پوچھا کہ "آپ کے پاس کرنسی زیادہ تو نہیں ہے۔" نہایت بھولے پن سے بولے "تمام رقم کا تو میں ڈرافٹ بنوا کر بھیج چکا ہوں۔ آخری مشاعرے کی آمدنی ہوئی تھی تو میں نے یہ بٹن بنوا لئے ہیں۔" کسٹم آفیسر کو بھی ان کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ اور اس نے کہا کہ جگر صاحب یہ بات اب انڈین کسٹم پوسٹ پر نہ کہیئے گا۔" تو جگر صاحب نے چونک کر پوچھا "کیوں صاحب کیا یہ جرم ہے؟" اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ واقعی یہ جرم ہے تو وہ برس پڑے ان صاحب پر

جن کے مشورے سے یہ بٹن بنوائے گئے تھے۔ کہ صاحب آپ نے آخر مجھ سے یہ جُرم کیوں کرایا؟"

(۴) "بمبئی کے ایک نہایت متمول فلم پروڈیوسر نے بڑی منت سماجت سے ان کو اپنے یہاں دعوت پر بُلایا اور ازراہِ عقیدت ان کی خدمت میں ایک کیسہ زر بھی پیش کیا۔ اس کے بعد اس فلم پروڈیوسر نے ان سے کہا کہ جگر صاحب میں اپنے کسی فلم میں استعمال کرنے کے لئے آپ کی یادگار کے طور پر آپ کا فلم بنانا چاہتا ہوں کہ جب آپ غزل پڑھ رہے ہوں تو فلم بن جائے۔ جگر صاحب آمادہ ہو گئے۔ ایک غزل پڑھ کر فلم بنوا دیا اور جب دوسری غزل کے لئے لائٹس ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جانے لگیں تو خمار بارہ بنکوی نے آکر ان سے کہا کہ سیٹھ جی کہتے ہیں کہ آپ دوسری غزل میں پگڑی باندھ لیں۔ یہ سننا تھا کہ جگر صاحب بپھر گئے کہ "صاحب یہ کیا تماشہ ہے یعنی پگڑی۔ میں نے کیا میرے باپ دادا نے کبھی پگڑی نہیں باندھی۔ میں قیامت تک پگڑی نہیں باندھ سکتا۔" اسی وقت سیٹھ جی بھی نظر آ گئے تو جگر صاحب نے وہ کیسہ زر ان کی طرف اُچھالتے ہوئے کہا "میں پگڑی نہیں باندھ سکتا۔ اور میں آخر پگڑی کیوں باندھوں۔" وہ بیچارہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ کہ یہ ماجرا کیا ہے اور جب جگر صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ خمار کی شرارت تھی تو ایک دم سے پھر شگفتہ ہو گئے اور خود بھی اس لطیفہ پر دیر تک

ہنستے اور ہنس ہنس کر دوسروں کو ہنساتے رہے۔"

حافظ غازی آبادی

"غازی آباد کے ایک مسٹر انور علی قریشی "شاعرِ مسلم لیگ" کہلاتے تھے اور بڑے خوش گلو اور بلند آواز شاعر تھے (آج کل لاہور میں قیام ہے) جگر صاحب کا قیام غازی آباد میں تھا۔ ان کی جائے قیام پر مقامی شرفا کا اجتماع تھا جو صاحب تشریف لائے جاتے تھے ایک صاحب انکا تعارف کرا رہے تھے، جب انور صاحب کا تعارف کرایا گیا تو بتایا گیا کہ جگر صاحب آپ ہیں شاعرِ مسلم لیگ جناب انور علی قریشی، جگر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا جی جی، اور پھر فرمایا "کیوں صاحب 'شاعرِ کانگریس' اور 'شاعرِ ہندو مہاسبھا' سے کب ملوائیے گا۔" جگر کے نزدیک شاعر صرف شاعر ہے اور کسی شخص کا واقعی شاعر ہونا بھی بہت بڑا کمال ہے، لہٰذا شاعر کے ساتھ کوئی اور دُم چھلا ان کو کبھی پسند نہیں آیا۔"

جگر

کا

شاعرانہ مُطالعہ

شعر گوئی جگر صاحب کوئی ۱۳-۱۴ برس کی عمر سے شعر کہتے ہیں انکا شعر کہنے کا بھی وہی عام اور روایتی طریقہ ہے جو دوسرے شعرا کا عموماً ہوتا ہے۔ لیکن انکے مزاج کے متعلق چند باتیں یہاں لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جگر صاحب مشاعروں کی طرح پر بہت کم شعر کہتے ہیں اور فرمائش پر یا فی البدیہہ تو شعر کہہ ہی نہیں سکتے۔ انکا کہنا ہے کہ جس کا جی چاہے مجھے شاعر سمجھے یا نہ سمجھے لیکن اس قسم کے مقابلے یا امتحان یا اکھاڑے میں کودنے کو میں تیار نہیں ہوں۔ جگر صاحب پر جب کیفیت طاری ہوتی ہے تب ہی شعر کہہ سکتے ہیں اور جب کیفیت طاری ہوتی ہے تو ہر وقت فکرِ شعر میں مست اور کھوئے رہتے ہیں۔ برابر گنگناتے رہتے ہیں۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکھتے جاتے ہیں۔ تقریباً ہر شعر کے بعد چاہتے ہیں کہ احباب میں سے کوئی پاس ہو جسے سنائیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کیفیت کے زمانے میں جگر صاحب پاخانہ گئے۔ اب وہاں سے جو واپس آئے تو پاجامہ باندھا نہیں بلکہ ایک ہاتھ میں کھلے ہوئے پاجامہ کا ازار بند پکڑے ہوئے، دوسرا ہاتھ طرح طرح

کے زاویوں سے ہوا میں گھمارہے ہیں۔ چہرے پر بہت دلآویز مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ گنگناتے جارہے ہیں اور سکر کی سی حالت میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے لہراتے چلے آرہے ہیں۔

ویسے جگر صاحب زیادہ رات گئے جب سب رخصت ہو جاتے ہیں تو تنہائی میں شعر کہنے کے عادی ہیں۔ اُس وقت ان کے پاس بہت رواں قلم، بہت روشن سیاہی اور بہت سے صاف شفّاف کاغذ یا پیڈ ہونے چاہئیں۔ کہنے کی صورت یہ ہے کہ زمین پسند آنا سب سے ضروری شرط ہے۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ قافیہ کی فراوانی ہے یا نہیں۔ ردیف دست د گریباں ہوتی ہے یا نہیں۔ بس جو بحر پسند آگئی اس پر کہنا شروع کر دیا۔ پہلے کاغذ پر نہایت خوش خط تغرے میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد جس زمین میں غزل کہہ رہے ہیں اس کا قافیہ اور ردیف اور جس قافیہ پر شعر کہہ رہے ہیں اس کے ساتھ دو تین لفظ لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً بہار آہی گیا جانِ بہار آہی گیا۔ جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا۔ پھر اس پر مصرع اولیٰ بڑے بانکپن اور بہت دور سے لگاتے ہیں جو نہایت باربط اور واضح ہوتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں کوئی خلا نہیں ہوتا ہے۔ ایک شعر مکمل ہونے تک کئی مرتبہ لکھا جاتا ہے اور کاغذ پر بہت سے نامکمّل شعر آدھے، تہائی اور چوتھائی لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک کاغذ کے بعد دوسرا شروع ہوتا ہے۔ اس پر

بھی پہلے اسی اہتمام سے بسم اللہ لکھی جاتی ہے۔ پھر تمام مصرعے صاف کئے جاتے ہیں۔ تب کہیں آگے کہنے کی فکر ہوتی ہے یھوڑی دیر میں لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک ڈھیر لگ جاتا ہے جن پر کہے ہوئے اشعار کے علاوہ طرح طرح کے نقش ونگار اور بیل بوٹے بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ جگر صاحب کو بیل بوٹے بنانے کا خاص ملکہ ہے۔ خصوصیت سے فکر شعر کے دوران وہ وہ اکثر جو کاغذ سامنے آتا ہے اس پر خوشنما بیل پھول بناتے رہتے ہیں۔

"جگر صاحب سے کبھی کبھی ڈنڈے کے زور سے بھی شعر کہلوا یا جاتا تھا۔ مولوی خورشید الحسن صاحب جنھیں بڑے بھیّا کہا جاتا ہے، بڑے دلچسپ بزرگ ہیں۔ آپ جگر صاحب کے بہت ہی خاص دوست ہیں۔ ایک زمانے میں جگر صاحب پر جمودی کیفیت طاری ہوئی اور مسلسل ایک یا ڈیڑھ سال تک شعر نہیں کہا بڑے بھیّا کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ جگر صاحب کو بجنور لے گئے جہاں مولوی صاحب موصوف کسی کالج میں پرنسپل تھے۔ کتنے ہی دنوں تک انھوں نے جگر صاحب کا موڈ بنانے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ مشاعرے کئے، ادبی صحبتیں فراہم کیں۔ سیر و تفریح کا سامان مہیّا کیا، لیکن جگر صاحب کسی طرح شعر کہنے کی طرف مائل نہ ہوئے تو ایک دن بڑے بھیّا ڈنڈا لیکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ ابھی شعر کہو ورنہ سر پھاڑ دوں گا۔ جگر صاحب نے ہر چند راہ فرار اختیار کی لیکن بڑے بھیّا بلائے بے درماں کی طرح ڈٹے ہی رہے

آخر مجبور ہو کر جگر صاحب نے شعر کہے ، اور تھوڑی ہی دیر میں پوری غزل کہہ لی ۔ اگر میری یاد دھوکا نہیں کھاتی ہے تو وہ غزل یہ تھی :۔

"فصلِ حسن ہے ان کی موسمِ شباب ان کا"

جگر بہت کم سنی سے شعر کہتے ہیں ۔ ابھی وہ اپنے والد سے پڑھتے ہی تھے کہ انھوں نے فارسی کے چند شعر کہے اور تنہائی میں اپنے چچازاد بھائی کو سُنا رہے تھے کہ والد نے سُن لیا ۔ محبت سے انھیں اپنے پاس بلایا ۔ غزل سنکر بہت ہمت افزائی کی ۔ ضروری اصلاح کر دی اور مناسب مشورے بھی دیئے ۔ یہیں سے جگر کی شاعری کی داغ بیل پڑ گئی ۔ اس کے بعد آپ نے اُردو غزلیں کہنا شروع کیں ۔ ابتدائی غزلیں جو زمانہ کے دست برد سے بچ گئیں وہ "داغِ جگر" میں شامل ہیں ۔

تلمذ | شاعری میں چند غزلیں دکھا کر ان پر اصلاح لینے کا جہاں تک تعلق ہے جگر صاحب کو ابتدا میں یعنی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک داغؔ سے تلمذ رہا ۔ اس کے بعد حیات بخش رسا بلند شہری ثم رامپوری اور منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے (کراچی میں[۱] انکے انتقال کے بعد جو بحث چھڑی اُس میں

[۱] میں نے جگر کے "سو شعر" شائع کئے ہیں ۔ ایک مرتبہ اس کا دیباچہ میں نے جگر صاحب کی خدمت میں پیش کر کے درخواست کی کہ اگر اس میں کوئی واقعاتی غلطی ہو تو درست فرما دیجئے ۔ اس میں میں نے ان کے خاندان کے بزرگوں کے نام ۔ ان کے اُستادوں کے نام ۔ انکے مدارس وغیرہ لکھے تھے ۔ استادوں میں داغ ۔ رسا اور تسلیم تینوں نام تھے ۔ موصوف نے بزرگوں کے ناموں میں ایک جگہ اپنے قلم سے ترمیم کر دی ۔ باقی کوئی ترمیم نہیں کی یہ اصلاح شدہ دیباچہ میرے پاس موجود ہے ۔

شاد اور رشید اکا محض افسانہ ہے) لیکن اگر شعری تربیت کو دیکھا جائے تو اصغر گونڈوی کا بہت فیض ہے۔ اصغر خود غالب کے ادارہ فکر کے شاعر ہیں البتہ اس میں سرخوشی اور شگفتگی خود ان کا اضافہ ہے۔ اگرچہ جگر نے انکے انداز فکر کی پیروی نہیں کی لیکن ان کے کلام میں جو سرخوشی ہے وہ بڑی حد تک اصغر کا فیض ہے۔ جگر اصغر گونڈوی اکے شاگرد تو نہیں لیکن اگر سچ پوچھئے تو یہی وہ ہستی تھی جس نے علی سکندر کو جگر بننے کے مواقع فراہم کئے۔ جگر میں تمام صلاحیتیں تو پہلے سے موجود تھیں لیکن دراصل یہ اصغر ہی کا پرتو تھا جس نے اس صلاحیت کو جلا کر کے چمکا دیا اور جگر کا شاعرانہ رُخ واضح طور پر متعین کر دیا۔ جگر کے کلام میں جابجا اس احسان کا تشکر اور اس حقیقت کا اعتراف ملتا ہے۔ غرض جہاں تک داغ۔ رسا اور تسلیم کی شاگردی کا تعلق ہے جگر کے لئے ان کا تلمذ محض تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک شاعری کی معنویت کا تعلق ہے جگر کو اصغر کا شاگرد معنوی سمجھنا غلط نہ ہوگا۔ اور جہاں تک شعر کی صوری حیثیت کا تعلق ہے جگر کا ذوقِ سلیم اور مشق سخن خود ان کے استاد ہیں۔

سنہ ۱۹۴۰ء سے پہلے سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں کی ایک فہرست شائع ہوئی تھی، اس فہرست میں جگر کا نام بھی شامل کیا گیا تھا جگر کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے دہلی کے اخبارات میں اس کی تردید شائع کرائی۔ ویسے

سیماب اکبرآبادی کا وہ بہت احترام کرتے ہیں اور ان کی فنی واقفیت کے وہ معترف ہیں۔

جگر صاحب احباب کا مشورہ نہایت فراخ دلی سے قبول کرتے تھے چنانچہ ایک واقعہ ہے:۔

"ایک بار جب وہ لکھنؤ سے مراد آباد آئے تو انھوں نے اپنی مجلس احباب میں ایک تازہ غزل سنائی۔ جب وہ غزل پڑھ چکے تو صہبا صاحب مراد آبادی مرحوم نے کہا کہ اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ جگر صاحب نے کہا ضرور کہیے" صہبا صاحب نے کہا "ذرا مقطع پھر پڑھ دیجئے"۔ جگر صاحب نے مقطع پڑھا:۔

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے سو موتی ہے ورنہ وہی دانہ ہے

صہبا صاحب نے مشورہ دیا کہ اس کا دوسرا مصرع یوں ہو تو اچھا ہے:۔

بندھ جائے سو موتی ہے رہ جائے سو دانہ ہے

جگر صاحب نے اس مشورہ کو فوراً قبول کر لیا"۔

شاگرد جگر اس قسم کے شاعروں میں نہیں ہیں جنھیں استاد بننے کا شوق ہوتا ہے یا جن کے ساتھ ساتھ شاگرد پہلوانوں کا ایک اکھاڑا رہتا ہے، نہ جگر استادی کے اہل ہیں۔ اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات جگر کے شاگرد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یا تو ان کے شاگرد ہیں

یا پھر فرضی اور خود ساختہ۔ دراصل جگرؔ اس صرف کے آدمی ہی نہیں انکو شاعری میں جن حضرات کی مدد کرتے دیکھا گیا ہے وہ صرف اتنا کہ ان کے اشعار پر اوّل۔ دوم۔ سوم نمبر ڈال دیتے ہیں یا کسی شعر کے سامنے چند تعریفی کلمات یا تنقیدی جملے لکھ دیتے ہیں۔ وہ محض اشارے کر سکتے ہیں جن کی مدد سے سمجھدار شاعر خود اپنے اشعار کی اصلاح کر لے۔ وہ خود کسی کی اصلاح نہیں کر سکتے دراصل وہ شعر کو ذوقِ سلیم پر تولتے ہیں اور یہ چیز ان کی طبیعت میں ایسی رچی ہوئی اور اتنی حاوی ہے کہ خفی نقائص پر ان کی نظر رکتی نہیں۔ ویسے وہ فن پر بھی کافی عبور رکھتے ہیں۔ غرض ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی بر استعداد ہے تو وہ خود استفادہ کرے گا۔ میں انگلی پکڑ کر چلانے کا قائل نہیں ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا شاعر استاد کبھی نہیں ہو سکتا۔

بہرحال حسب ذیل حضرات جگرؔ صاحب کے رنگ کے صحیح پیرو سمجھے جا سکتے ہیں اور انھوں نے جگرؔ سے استفادہ بھی کیا ہے۔ نیز جگرؔ صاحب نے بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر ان کی رہبری اور اعانت فرمائی ہے۔

۱۔ تربینی سرن شادؔ (مین پوری)

۲۔ بہاری چرن صادقؔ (مین پوری)

۳۔ شارقؔ (کانپور)

۴۔ ساجد علی خاں رازؔ (مرادآباد)

۵۔ حمید صدیقی لکھنوی

۶۔ محترمہ زلفی (بھوپال)

۷۔ سعید الحسن دور (کانپور) ۸۔ عبدالرزاق بیخود

معاصرین | جگر صاحب اپنے ہم عصر شعرا میں حسرت۔ اصغر اور فانی کے بیحد معترف ہیں۔ رہے اقبال و جوش وہ چونکہ نظم گو شعرا ہیں اور نظم کو وہ حقیقی شاعری تصور نہیں کرتے۔ اس لئے ان سے بنیادی شاعرانہ اختلاف ہے۔ یوں مفکر کی حیثیت سے وہ اقبال .... کے قائل ہیں۔ جگر صاحب غزل کے بہترین شاعر ہیں۔ اس لئے فطرتاً غزل کہنے والے معاصرین کے وہ معترف اور اس روش سے ہٹ کر کہنے والوں کے وہ قائل نہیں۔ قدما میں بھی وہ میر مومن اور داغ کے زیادہ معترف ہیں۔

اصغر گونڈوی سے تو جگر کو انتہائی عقیدت ہے اور ان کے کلام کو وہ بڑے احترام سے دیکھتے ہیں۔ جگہ جگہ اپنے اس احترام کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ فانی سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ جس مشاعرے میں فانی شریک ہوتے تھے اور مجھے بھی ہم طرح غزل کہنا پڑتی تھی تو بہت سنبھل کر بڑی محنت اور حزم و احتیاط سے کہتا تھا۔ رہے حسرت تو ان کے شاعرانہ کمالات اور شاعری میں ان کے مقام کے اسی طرح قائل ہیں جیسے اردو کے تمام نقاد۔

اب رہے دوسرے شاعر مثلاً سیماب اکبرآبادی۔ سائل و بیخود دہلوی ظفر علی خاں۔ وحشت کلکتوی۔ عزیز۔ اثر و ثاقب لکھنوی۔ نوح ناروی۔ فراق گورکھپوری۔ قمر جلالوی وغیرہ تو ان میں سے اکثر کے مہارتِ فن اور شاعرانہ خوبیوں کے اور بعض کے ذاتی خصائل کے جگر صاحب معترف ہیں لیکن نظم گو شعرا مثلاً صفی لکھنوی۔ حفیظ جالندھری سے وہی ان کا نظم یا غزل۔ تفصل یا اجمال کا بنیادی اختلاف ہے۔

باقی شعرا مثلاً مجاز لکھنوی۔ ساغر نظامی۔ روش صدیقی۔ احسان بن دانش مجروح۔ شکیل بدایونی۔ ماہر القادری وغیرہ کو وہ اپنا خورد سمجھتے ہیں اور ان سے بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں اور یہ حضرات بھی ان سے ادب و احترام اور خلوص سے ملتے ہیں۔ وہ تمام نوجوان شعرا کو دل کھول کر داد دیتے ہیں اور انکی ہمت افزائی کرتے ہیں بخل سے کام نہیں لیتے۔ صرف نااہل اور بزعمِ خود غلط شعرا سے وہ گھبراتے ہیں لیکن حتی الامکان ان کی دل شکنی کبھی نہیں کرتے۔

موجودہ دور کے ترقی پسند شعرا سے بھی ان کا اختلاف بنیادی ہے ترقی پسند شعرا شاعری کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ جگر صاحب شاعری کے وجدانی اور جذباتی۔ ذوقی اور تخیلی پہلو کے قائل ہیں اور اسے انقلاب یا اصلاح کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند شعرا کو قدیم روایات کا منکر یا ان سے برگشتہ تصور کرتے ہیں۔ ویسے ترقی پسند شعرا سے

ان کی تعلقات بہت شگفتہ ہیں اور وہ لوگ بھی آپ کو اپنا ایسا مخالف جس سے کوئی خطرہ ہو نہیں گردانتے۔ اکثر ترقی پسند شعرا کے اجتماعات میں جگر صاحب شریک ہوئے ہیں اور وہاں ان کا شایانِ شان خیر مقدم ہوا ہے۔

مشاعرہ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہو گا کہ جگر صاحب کا موجودہ عروج اور ان کی مقبولیت زیادہ تر مشاعروں کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے بعد ملک کے رسائل کا ہاتھ ہے۔ جتنے زیادہ اور جتنے بڑے بڑے مشاعروں میں جگر صاحب شریک ہوئے، بہت کم شعرا کو اس کے مواقع ملے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود جگر صاحب اگرچہ مشاعروں اور قوالی کو اردو زبان کی ترویج کا بہت اچھا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن شاعری کے نقطۂ نظر سے اسے شعری اکھاڑا یا ادبی دنگل کہتے ہیں۔ اس لئے وہ انکی شرکت سے بالطبع گھبراتے ہیں، بھاگتے ہیں لیکن جتنا وہ بھاگتے ہیں اُتنا ہی پکڑے جاتے ہیں اکثر میرا تجربہ ہے کہ وہ مشاعرے کو خراب کرنے اور کارکنان مشاعرہ کو سزا دینے کے لئے عمداً انتقاماً شراب پی لیا کرتے تھے۔ اکثر جب پوچھا گیا تو فرمایا کہ "تم جانتے ہو کہ مشاعروں سے میں گھبراتا ہوں اور خلافِ طبیعت شریک ہوتا ہوں اور خلافِ طبیعت کام کرنے سے جو تکدر ہو جاتا ہے اسے رفع کرنے اور اپنے آپ کو مشاعرے کی شرکت کے لئے تیار کرنیکے لئے خود فراموشی ضروری ہے لہذا میں پی لیتا ہوں" لیکن میری رائے یہ ہے کہ

یہ بھی صرف پینے کے بہانے تھے مقصد محض پینا ہوتا تھا۔ اس سے زیادہ سب شاعری تھی۔

غرض جگر جس مشاعرے میں شریک ہوتے کچھ تو اپنے کلام کی وجہ سے کچھ اپنے ترنم کی بدولت اس پر چھا جاتے اور سامعین کی یہ حالت ہوتی جیسے سارا مجمع دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس میں بوڑھے اور جوان۔ قدیم تعلیم یافتہ اور جدید روشن خیال لوگ۔ پڑھے لکھے اور بے پڑھے۔ اعلیٰ طبقہ اور ادنیٰ طبقہ کے سب لوگ شامل ہوتے اور سب کی بیخودی کی ایک سی حالت ہوتی۔

جگر صاحب مشاعروں میں صرف کلام سنانے کے انداز سے نہیں بلکہ سننے کی انداز سے بھی شریک ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کو آداب مشاعرہ کے خلاف سمجھتے کہ عین وقت پر مشاعرے میں آئے اپنا کلام سنایا اور چل دیئے اکثر بعض استاد قسم کے شعرا کو دیکھا ہے کہ مشاعروں میں چپ سادھے ہوئے سب سے اس طرح الگ تھلگ۔ اور بے تعلق سے بیٹھے رہتے ہیں گویا وہ سب سے بلند اور ارفع ہوں۔ جگر صاحب ایسا نہیں کرتے۔ وہ اپنے آپکو سامعین کا ایک جزو سمجھتے، اور اگرچہ مشاعروں میں بلا وجہ اچھل کود نہیں کرتے لیکن شعرا کو موقعہ موقعہ سے داد دیتے، بخل سے کام نہیں لیتے۔

ترنم | پہلے زمانے میں اشعار ترنم سے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ عموماً شعراء

اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے۔ اس میں زیادہ اثر پیدا کرنے کے لئے شعراء اپنے حرکات و سکنات سے، چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اور اپنی آنکھوں کی جنبش سے مدد لیتے تھے لیکن بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ترنّم کے ساتھ اشعار سنانے کا رواج ہو گیا اور رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ اب تو ۷۵ فیصدی شاعر اپنا کلام ترنّم سے سناتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس شاعر نے ترنّم شروع کیا لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا ہے سائل دہلوی اور اقبال اسکے پیش رو سمجھے جاتے ہیں۔ جگر نے اس تحریک میں ایک خاص جان ڈال دی وہ موسیقی سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں اور آواز میں بھی بڑی دلفریب کھنک پائی جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ابتدا ہی سے ترنّم سے پڑھنا شروع کیا اور ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ مقبولیت محض ترنّم کی بدولت ہے۔ چنانچہ اکثر شعرا نے تحت اللفظ ترک کر کے ترنّم اختیار کر لیا۔ بہتوں نے تو اپنی طرز خود بنائی لیکن اکثر نے محض جگر کی نقل اتاری۔ جگر اس نقالی کو پسند نہ کرتے تھے اس لئے جیسے ہی انکے پڑھنے کی طرز عام ہوئی کہ انھوں نے اسے بدل دیا اور نئی طرز اختیار کر لی۔ اس طرح کم از کم تین بار انھوں نے اپنی طرز بدلی۔ ہر طرز پہلے سے زیادہ موثر اور دلکش ہوتی تھی اور اس وقت ان کی جو طرز ہے اس میں ان کی بڑھتی ہوئی عمر اور گرتی ہوئی صحت کا بھی خاص لحاظ ہے۔

ابتدا میں اکثر حضرات ترنم پر معترض ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب مشاعرہ میں ہر شاعر کے ساتھ مزامیر کا ایک طائفہ بھی آیا کرے گا۔ جگر صاحب سے اکثر اس قسم کے اعتراضات پر گفتگو ہوئی تو جگر صاحب نے کہا "یہ شاعر کا سامعین پر احسان ہے کہ وہ ترنم سے سامع کی ذہنیت اس بلند سطح تک لے آتا ہے جہاں وہ اسکے اشعار سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا اہل ہو جاتا ہے" اور واقعہ بھی یہی ہے۔ اکثر اس کا تجربہ ہوا ہے کہ جگر جب اپنا کلام ترنم سے سناتے ہیں تو اشعار میں وہ لذت محسوس ہوتی ہے اور اس کے وہ پہلو نمایاں ہونے لگتے ہیں جو ان کا کلام خود پڑھنے سے نہیں ہوتے۔ ان کے پڑھنے میں ایک سحر ہے، ایک جادو ہے کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں یا بیساختہ چیخ اٹھتے ہیں اور یہ کہنا بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ جگر کی اس عام مقبولیت میں کچھ نہ کچھ ان کے پڑھنے کے طرز کو بھی دخل ہے۔

طباعتِ کلام جگر صاحب کا ابتدائی کلام مرزا احسان احمد صاحب بی اے۔ ال ال بی، ناظم بزمِ ادب اعظم گڑھ کی نگرانی میں انہی کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ بزمِ ادب کی جانب سے داغِ جگر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کلام ۱۸ × ۲۲، ⅛ سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے لیکن غالباً ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ہے۔

اس میں تمامتر غزلیں اور صرف ایک مثنوی "سرودِ حقیقت" ہے۔ ہر صفحہ پر اوسطاً دو غزلیں درج ہیں۔

اس کے بعد چھ برس تک جگر کا کوئی کلام مرتب اور شائع نہیں ہوا صرف ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں آپ کا کلام چھپتا رہا یا احباب کے پاس جستہ جستہ جمع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۲ء سے قبل بھوپال کے نواب زادہ رشید الظفر خاں صاحب نے جگر صاحب کا کلام شائع کرانا منظور فرمایا اور اس کام کے لئے حامد سعید خاں صاحب حامد بھوپالی کو متعین کیا۔ موصوف نے جگر کا جو کلام جمع کیا اس کا نہایت سختی سے مختصر انتخاب کیا اور اس انتخاب میں اپنے مذاق کو کافی دخل دیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے جگر سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ غرض ۳۲ء میں یہ "شعلۂ طور" کے نام سے چھپ کر تیار ہوا۔ یہ ۲۰ × ۳۰، ۱/۱۶ سائز پر تقریباً ۱۲۵ صفحات پر مشتمل تھا اور اس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ بھی تھا۔ کتابت وطباعت بہت اچھی تھی۔

غرض جب یہ چھپ کر آیا تو اسے دیکھ کر جگر صاحب کو سخت صدمہ ہوا اور بقول ان کے اتنا "بے رحمانہ" انتخاب، ان کو بہت ناگوار گزرا۔ حامد صاحب سے انھیں سخت شکایت پیدا ہو گئی اور ان باتوں کا اظہار انھوں نے بالاعلان کرنا شروع کیا۔ جب نواب زادہ صاحب کو اطلاع ملی تو انھوں نے دیوان کی اشاعت بالکل روک دی۔ ابتدا میں تو اس کا ایک نسخہ

میری نظر سے گزرا تھا لیکن اس کے بعد سے کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ معلوم نہیں کہ سب جلا دیا گیا یا کہیں بند کر کے رکھ دیا گیا۔

سنہ ۳۲ء کے بعد جب جگرؔ صاحب واپس لکھنؤ گئے تو انھوں نے غالباً نواب علی حسن خاں سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا۔ موصوف نے شعلۂ طور کی از سرِ نو ترتیب کا کام شروع کر دیا اور اپنے لڑکے نواب سید شمس الحسن بی اے ال ال بی کے سپرد یہ کام کیا۔ انھوں نے جگرؔ صاحب کے اکثر احباب کو خط لکھ لکھ کر مختلف مجموعے جمع کیے جن میں سب سے بڑے مجموعے میرے اور جلیل قدوائی کے تھے۔ سید شمس الحسن صاحب اور جگرؔ صاحب نے مل کر ان سب سے جدید شعلۂ طور ترتیب دیا۔ شمس صاحب نے اپنے ایک عزیز "ادیاما" آرٹسٹ سے جگرؔ صاحب کا ایک قلمی خاکہ کھنچوایا اور یوں بالآخر اسے مرتب کر لیا۔

یہ شعلۂ طور تقریباً ۲۵۰ صفحات پر چھپا ہے اور قیاس یہ ہے کہ جگرؔ صاحب کے کلام کا کوئی حصہ جسے جگرؔ صاحب شائع کرانا چاہتے ہوں شامل ہونے سے نہیں رہا۔ بعد میں سنہ ۴۳ء تک غیر مطبوعہ کلام کا اسی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا حجم ۴۰۵ صفحے تک پہنچ گیا۔ اس میں جگرؔ صاحب کے کلام کو چار ادوار میں تقسیم کر کے چاروں دوروں کا کلام الگ الگ ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کہ پہلے دور میں داغؔ جگرؔ کا انتخاب خود جگرؔ سے کرا کے شامل کیا ہے

دوسرا دور داغ جگر کی اشاعت کے بعد کے کلام میں پر مشتمل ہے۔ تیسرا این پوری کے قیام کے زمانہ کے کلام پر اور چوتھا لکھنؤ کے قیام کے زمانہ کے کلام پر مشتمل ہے۔ غزل کے نیچے یہ بھی درج ہے کہ کس شہر میں کہی گئی۔ اس میں اُردو غزلوں کے علاوہ جگر صاحب کی ۱۴۰۔ اُردو نظمیں۔ دو فارسی نظمیں۔ ایک رُباعی اور فارسی کی متعدّد غزلیں شامل ہیں۔

جب یہ دیوان مرتب ہو گیا تو نواب علی حسن خاں نے ایک خوشنویس سے بات کر کے اسے ہدایت دی کہ کل صبح کوٹھی پر آجانا۔ صبح جب، وہ آیا تو نواب صاحب کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وصل بلگرامی صاحب اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ خیر وہ آکر بیٹھے اور اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ جگر صاحب کا کلام شائع ہو رہا ہے اور کہا کہ جگر صاحب کے یا آپ کے بس کا یہ روگ نہیں اس لئے میں آگیا ہوں سب کام میں انجام دیدونگا۔ آپ لوگوں کو کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد مسودہ دیکھا۔ بطور خود خوشنویس کو ضروری ہدایات دیں اور نواب صاحب سے روپیے حاصل کر کے وہ چلے گئے۔ بالآخر ۳۲ء میں شعلہ طور چھپ کے شائع ہو گیا۔ میں اس وقت دہلی میں تھا۔ اخباروں میں شعلہ طور کا اعلان دیکھا کہ وصل بلگرامی کے یہاں سے مل سکتا ہے۔ میں مکتبہ جامعہ دہلی کی جانب سے اسے حاصل کرنے کی غرض سے لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچکر جگر صاحب اور علی حسن خاں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ جگر صاحب سے

اس کی فروخت اور اشاعت کا کام ہو نہیں سکتا۔ اس کے لئے کوئی معتبر ادارہ ہی مقرر کرنا ضروری ہے اور مکتبہ جامعہ اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ نواب صاحب موصوف نے فرمایا کہ "یہ دیوان جگر صاحب کا ہے اور اس کی تمام آمدنی کے وہی مالک ہیں۔ آپ ان کے دوست ہیں جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔ لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ شعلہ طور میرے یا جگر صاحب کے قبضے میں نہیں ہے وہ وصل بلگرامی کے قبضے میں ہے۔ آپ ان سے حاصل کرنے کی کوشش کیجیے میں بھی آپ کی پوری امداد کروں گا۔" غرض میں جگر صاحب اور شمس الحسن صاحب کو ساتھ لیکر وصل صاحب کے یہاں حاضر ہوا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ موصوف نے جگر صاحب کے ہمدرد کی طرح بڑی سخت سے سخت شرائط پیش کیں۔ میں نے سب مکتبہ جامعہ کی جانب سے منظور کرکے تحریر دیدی اور شام تک شعلہ طور کی تمام جلدیں پیک کرا کے بک کرائیں اور دہلی واپس ہو گیا۔ مکتبہ جامعہ نے ایک سکھ آرٹسٹ سے جو دہلی میں قرولباغ میں رہتا تھا، بہت خوبصورت گرد پوش کا تیج رنگا ڈیزائن بنوا کر چھپوایا اور اسے شائع کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک تقریباً چھ اڈیشن شائع ہوئے۔ پھر ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مکتبہ میں آگ لگا دیئے جانے کے بعد اس کا معاہدہ ختم ہو گیا۔

اس کے بعد ایک اشاعت کے حقوق جگر صاحب نے محمد طفیل صاحب ایڈیٹر نقوش لاہور کو دیئے جنھوں نے وہی شعلہ طور بڑی نفاست اور بڑے

سلیقے سے شائع کیا ایسا کہ جگر صاحب کا اس کی اشاعت کے متعلق جو خواب تھا وہ پورا ہو گیا۔ اب وہ اڈیشن بھی ختم ہو چکا ہے[1]۔

۱۹۴۳ء کے بعد کا جگر صاحب کا کلام آپ کے دوسرے دیوان "نسیمِ جگر" کی صورت میں جمع ہوتا رہا۔ ۱۹۵۳ء میں آپ نے اس کی اشاعت کی اجازت این۔ ایم خان صاحب .... کی معرفت پاکستان کوآپریٹو سوسائٹی ڈھاکہ کو دی جس نے "آتشِ گل" کے نام سے بڑے سائز پر غالباً ۱۹۵۴ء میں شائع کر دیا۔ یہ ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک مقدمہ پروفیسر آل احمد سرور کا اور ایک مقدمہ رشید احمد صدیقی کا شامل ہے۔ اردو کی ۹۷ غزلوں اور ۴ نظموں کے علاوہ دو فارسی غزلیں بھی شامل ہیں۔

اس پر حکومتِ ہند نے بہترین ادبی تخلیق کی حیثیت سے آپکو پانچ ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

اب بہت تھوڑا کلام آپ کا غیر مطبوعہ باقی ہے۔ کیونکہ ادھر مسلسل علالت کی وجہ سے آپ عرصہ سے کچھ کہہ نہیں سکے ہیں۔

شراب اور شاعری شراب کے زمانہ میں اکثر حضرات جگر کو اس لئے شراب پلایا کرتے تھے کہ ان سے خوب کلام سنا جائے اور بہت سے صحابؔ کا اب یہ خیال ہے کہ جگر کی شاعری میں شراب ترک کرنے کے بعد وہ مزا نہیں رہا جو پہلے تھا۔ وہ شراب کو جگر کی شاعری کا محرک سمجھتے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے

---

[1] غالباً اسکی پلیٹیں طفیل صاحب کے پاس محفوظ تھیں۔ ان سے اب پھر شائع کیا گیا ہے۔

دوسرے حضرات پر شراب کیا اثر مرتب کرتی ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جگر کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شراب پی کر جگر صاحب صحیح طور پر اپنا کلام کبھی نہ سُنا سکے ہمیشہ ابتدائی سرور کی حالت میں وہ بے ربط طور پر غزلوں کے مختلف اشعار پڑھتے تھے۔ جب نشہ تیز ہوتا اشعار پڑھنا قطعاً بند ہو جاتا۔ رہا شاعری کرنے کا سوال تو میں پورے اعتماد سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جگر صاحب نے شراب پی کر کبھی ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا، پوری غزل کہنا تو بڑی بات ہے۔ البتہ بعض بعض غزلیں نشہ کے اُتار کے زمانہ میں انھوں نے ضرور کہی ہیں جنکو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معیار ان غزلوں کے مقابلے میں کتنا پست ہے جو ہوش کے زمانہ میں کہی گئیں۔ مثلاً ۳۲ء میں بھوپال میں انھوں نے جو غزلیں کہیں ان کا معیار ان غزلوں کے مقابلے میں بہت بلند ہے جو انھوں نے سیہور میں کہیں اور ان کے بھوپال کے احباب اس امر کی تصدیق کریں گے کہ بھوپال کی غزلیں ہوش کے زمانہ کی اور سیہور کی نیم مدہوشی کے زمانہ کی ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اب جگر کی شاعری میں بعض حضرات کے خیال کے مطابق وہ مزا نہیں رہا جو شراب کے زمانہ میں ہوتا تھا تو یہ شاعری کو شاعر کے حالات کی روشنی میں نہ دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جگر کے یہاں خالص رومانی عنصر اب کم ہو گیا ہے اور یہ عمر کا عین تقاضا ہے۔ جوانی ختم ہونے کے ساتھ انسان

میں اُمنگ اور ولولہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ جذبات میں وہ ہیجان باقی نہیں رہتا جو جوانی کے زمانے میں ہوتا ہے اور شاعری کا تعلق جذبات ہی سے ہے۔ چنانچہ بڑھاپے میں ولولے، جوش، رنگینی اور سرخوشی میں کمی آنا لازمی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کلام میں پختگی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور خیالات میں تفکر اور گہرائی کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی حال جگر صاحب کا ہے۔ اب ان کے یہاں جو عمق پایا جاتا ہے اور خیالات میں جو پختگی پیدا ہو گئی ہے وہ سمجھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن اس گہرائی و پختگی کے باوجود اس کے اظہار میں شوخی نہ سہی لیکن رنگینی وہی پائی جاتی ہے جو ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

ادوار جگر کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سمجھنے کی سہولت کے خیال سے ہم ان دوروں کو ان کے مستقر کے لحاظ سے نامزد کر سکتے ہیں۔

۱۔ پہلا دور۔ ابتدائی دور جب ان کا مستقر مراد آباد۔ آگرہ اور گونڈہ تھا اور اُس زمانہ کا کلام داغِ جگر میں موجود ہے جس پر داغ کا رنگ حاوی ہے۔

۲۔ دوسرا دور۔ ان کے اعظم گڑھ اور مین پوری کے قیام کا ہے۔ اسمیں فکر اصغر کا پرتو ہے۔

۳۔ تیسرا دور۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانہ کا۔ یہ ان کا بہترین دور ہے۔ اس میں جگر اپنے صحیح رنگ میں بالکل عروج پر نظر آتے ہیں (دوسرے اور تیسرے دور کا کلام شعلہ طور میں درج ہے لیکن اس میں ان دو دوروں کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مین پوری کے کلام کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے

یعنی شعلہ طور کا دَور دُوم اور سوم۔ دراصل انھیں ایک ہی ہونا چاہیئے کیونکہ دونوں کا رنگ قریب قریب یکساں ہے۔ اس لیئے ان دونوں کو ہم نے ایک ہی دَور قرار دیا ہے۔

چوتھا دَور۔ یعنی موجودہ دَور، جو ان کے گونڈے کے دوبارہ قیام کے زمانہ سے متعلق ہے اور "آتش گل" پر مشتمل ہے۔

تدریجی ترقی پہلے دَور میں جگر سادہ خیالات سادہ زبان میں ادا کرتے ہیں لیکن عام تاثر میں وہ اپنے زمانے کے دوسرے شعرا سے ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جنھیں سنکر پڑھنے والے کچھ اس طرح چونک پڑتے ہیں جیسے سیّد سلیمان ندوی پہلے پہل ان کا کلام سُنکر چونک پڑے تھے۔ غرض پڑھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بات تو بالکل نئی ہے یا کم از کم اس کا انداز اتنا دلکش اور نیا ہے کہ پہلے کبھی اس طرح سُننے میں نہیں آئی تھی اسی بات کو ہم جگر کا خاص رنگ یا ان کی انفرادیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

دُوسرے دَور میں آسان خیالات مشکل الفاظ میں ملیں گے لیکن اس میں جگر کی انفرادیت اور زیادہ نکھر آئی اور اصغر کے تفکر یا غالب کے فلسفہ کا اثر نمایاں نظر آنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ خیالات کی گہرائی یا بلندی کا تقاضا ہوتا ہے کہ مشکل الفاظ لائے جائیں یا آجائیں۔ یہ بالکل فطری امر ہے۔ چنانچہ اس دَور میں جگر کے یہاں...... مشکل الفاظ آگئے ہیں اور خیالات میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ان کی انفرادیت نے اسے اپنے رنگ پر حاوی ہونے نہیں دیا۔

تیسرے دَور کو دوسرے دور کا برعکس سمجھنا چاہیئے۔ اس میں بلند اور عمیق خیالات آسان الفاظ میں پیش کئے گئے ہیں اور اس زمانہ میں جگر کی انفرادیت اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ جسے جگر کو ان کی اصلی شاعرانہ شکل میں دیکھنا ہو اسے اس دَور کے کلام کا یعنی شعلۂ طور کے دَورِ چہارم کے کلام کا مُطالعہ کرنا چاہیئے۔ جہاں اسے ایک جلوہ بے محابا۔ ایک شعلہ عریاں نظر آئیگا۔ جس میں جگر کی شاعری کے صحیح خدو خال تڑپتے نظر آئیں گے اور جس میں جگر کی انفرادیت سے معمور ایک حسین وجمیل تصویر نظر آئے گی جس کی دلکشی سے مسحور ہو جانا یقینی ہے۔

چوتھے دَور میں بلند اور عمیق خیالات مشکل الفاظ میں ملتے ہیں۔ اس میں عمر کے تقاضوں اور خیالات کی پختگی کو بھی بہت کچھ دخل ہے جس کی وجہ سے خیالات میں کافی گہرائی پیدا ہو گئی ہے لیکن اس فلسفیانہ قسم کی شاعری میں بھی جگر کی انفرادیت بہر نوع جلوہ گر ہے۔

مختصر یہ کہ شاعری کے لحاظ سے تیسرا لکھنوی دور اور شاعر کے لحاظ سے موجودہ دَور گویا حاصل کلام یا حاصل جگر ہیں۔

خُلاصہ

دَورِ اوّل ۔ مُرادآباد۔ آگرہ۔ آسان خیالات۔ آسان زبان وطرز ادا

دَورِ دُوم۔ گونڈہ اعظم گڈھ۔ مین پوری	آسان خیالات	مشکل زبان وطرزِ ادا	
دَورِ سُوم ۔ لکھنؤ	بلند "	آسان " "	
دَورِ چہارم ۔ گونڈہ	" "	مشکل " "	

شِعری نظریات جگر کے چند شعری نظریات خود انھیں کے الفاظ میں درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(۱) "فلسفہ وحکمت، شعروادب سے قوم اور ملک میں کوئی عملی انقلاب نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ شعروادب خود نتیجہ ہوتے ہیں حالات اور واقعات کا۔" مقدمہ فہمی

(۲) "انقلاب کا اصل سبب قائد کی عملی زندگی اور عملی زندگی کی رُوحِ رواں صداقت ہے۔" مقدمہ فہمی

(۳) "جن حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ شعروشاعری کی تمام لطافتیں صرف مادیات میں حسبِ دلخواہ تغیر وانقلاب پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ وہ صحیح معنوں میں نہ آرٹ کو سمجھتے ہیں نہ آرٹسٹ کو۔" مقدمہ فانی

(۴) "میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ شاعری اور صرف شاعری سے دنیا کی سلطنتوں میں عظیم الشان انقلابات اور تغیرات رونما ہوئے۔" مقدمہ فانی

(۵) "بعض حضرات شاعری کو آرٹ کہنے کے باوجود اس کو مفید صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور مفید وغیر مفید کا معیار انہی کی ایجاد واختراع کا رہینِ منت ہو۔" مقدمہ فانی

(۶) "افادی پہلو کے پیشِ نظر کبھی شاعری نہیں کی جاتی۔ شاعری صرف برائے شاعری ہوتی ہے اور کرنا چاہیئے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری سے زندگی میں کوئی دوسرا کام بھی لے لیا جائے لیکن تخلیق کرنے والے کو شاعری افادیت کے خیال سے نہیں کرنا چاہیئے۔"

(۷) "میں آرٹ کی تعریف میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ وہ آرٹ ہے۔ شاعری شراب کو نہ شرابِ معرفت کہنا چاہتا ہوں نہ خوشۂ انگور کا حاصل۔" مقدمہ فانی

(۸) "شاعر کی استعداد فطری اس کے فطری حالات کی مناسبت سے جس رنگ کو چاہے اختیار کرلے۔ شاعر کی باطنی استعداد جس رنگ کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ہمیشہ وہی اس کی شاعری کا کامیاب رُخ ہوا کرتا ہے۔"

مقدمہ فانی

(۹) "شاعر کی زندگی سے اس کی شاعری مختلف نہ ہونا چاہیئے۔ جتنی اسکی زندگی سے اس کی شاعری الگ ہوگی اتنا ہی وہ صداقت سے دور ہو جائے گی۔ جوان شاعر کو بوڑھے خیالات اور بوڑھے شاعر کو جوان خیالات ظاہر کرنا محض تصنّع ہے اور تصنّع اور شاعری میں سخت تضاد ہے۔"

(۱۰) "عروج و نزول۔ نزول و عروج یہ عجیب متضاد حقیقتیں ہیں جن کو اگر نمایاں طور پر اجتماعی صورت میں دیکھنا ہے تو وہ ایک سچے شاعر کے کلام میں ملینگی۔"

مقدمہ فانی

(۱۱) "دنیا کی ہر چیز ایک حقیقت ہے اور ہر حقیقت میں ایک صداقت ہوتی ہو اس لئے تمام متضاد حقیقیں جدا جدا اپنی جگہ پر صداقت ہیں۔"

(۱۲) "شاعر دنیائے مشاہدات و محسوسات کے ہر ہر ارتعاش و سکون سے متأثر ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب اس تاثر کا روکنا مشکل ہوجاتا ہے اور شاعر از خود رفتہ ہوکر اپنی بلند مقامیوں کو بھول جاتا ہے اور اس پستی کی طرف اتر آتا ہے جسے اپنی اصطلاح میں وہ کبھی حُسن کہتا ہے کبھی عشق"۔ مقدمہ فانی

(۱۳) "شاعر تمام تاثرات اپنی غذا لئے روح کی حیثیت سے اپنے اندر جذب کرلیتا ہے اور فضلہ شعر کی صورت میں خارج ہوجاتا ہے"۔

(۱۴) کبھی شاعر پھولوں کی رنگینی و رعنائی میں ہولناک خارزار مشاہدہ کرتا ہے اور کبھی اس کو ایک ایک کانٹا فردوس بدامن نظر آتا ہے"۔ مقدمہ فانی

(۱۵) "عالمِ کیف و حال کی تمام حقیقیں دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتیں یا تو شاعر ان سے اکتساب غم کرے گا یا اکتساب مسرت، غم و مسرت کے علاوہ جو چیز ہے در اصل انہی دونوں حقیقتوں کا ایک لطیف ترین امتزاجی کیفیت کا توازن صحیح ہے"۔ مقدمہ فانی

(۱۶) جب تک حقیقتیں مسائل کی صورت میں بیان کی جائیں ہمیشہ شاعری ناکام رہے گی لیکن ان کو حسن و عشق کی چاشنی دے کر پیش کیا جائیگا تو دل میں اتر جائیں گی"۔ مقدمہ فانی

(۱۷) "الفاظ۔ بے جان الفاظ شاعر کے سرمدی نغموں میں روح بیداری پیدا نہیں کرسکتے بلکہ خود اس کے نغمے الفاظ میں روح بھر دیتے ہیں"۔ مقدمہ فانی

(۱۸) "اکثر حضرات فخریہ یہ کہتے ہیں کہ غالب یا میر و مومن کی تقلید کرتے ہیں۔ حالانکہ شاعر کی اس سے زیادہ کوئی توہین نہیں۔ اس طرح ان کی ہستی باقی نہیں رہ جاتی"۔

(۱۹) کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ رسولوں کے علاوہ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ نقص ضروری ہے۔ اسی طرح انسان کے کلام کو بھی نقائص سے بتمامہ پاک و صاف نہ ہونا چاہیئے"۔

(۲۰) "انسان کی طرح خدا اشعار پر بھی عذاب نازل کرتا ہے۔ چنانچہ جس شعر پر عذاب نازل کرنا ہوتا ہے اسے وہ کسی غیر شاعر قسم کے شاعر پر نازل کر دیتا ہے"۔

(۲۱) جو قوم روبہ ادبار ہوتی ہے اُس قوم میں شاعر زیادہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ شاعری بے عملی کی ترغیب دیتی ہے اور بے عملی افلاس پر منتج ہوتی ہے"۔

(۲۲) ادنیٰ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ارفع شاعر اپنے ماحول کا خالق ہوتا ہے۔ اس کی شاعری سے نیا ماحول پیدا ہوتا ہے"۔

غزل میں درجہ یہ کتاب تنقیدی حیثیت سے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ ذاتی جائزہ کی حیثیت سے ہے اور یہ موضوع کہ جگر کا اردو غزل میں کیا مقام ہے بالکل تنقیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے تفصیل سے اس موضوع پر لکھنے

کا خیال نہیں ہے۔ صرف سرسری جائزہ کے طور پر ہم اردو شاعری کا پس منظر اور غزل میں جگر کے درجہ اور حیثیت پر روشنی ڈالیں گے۔

غدر سے کچھ پہلے سے اردو شاعری میں انحطاط کا دور شروع ہو گیا تھا عوام کی سماجی اور اخلاقی حالت بد سے بدتر ہونا شروع ہوئی تو اس کا اثر اردو شاعری پر بھی پڑا اور اس میں ابتذال پیدا ہو گیا اور شاعری اعلیٰ جذبات کی تابع ہونے کے بجائے نفس کی تابع ہو کر رہ گئی۔ قوم پر عام طور سے افسردگی اور پژمردگی طاری تھی۔ شاعری پر بھی اس کا اثر پڑا کیوں کہ شاعری حالات کی آئینہ دار ہوتی ہی ہے۔ نیز جدت خیال اور تنوع مفقود ہو گیا۔ اسکے بجائے فسردگی عام طور پر کارفرما نظر آنے لگی۔ گویا غدر سے کچھ پہلے سے اردو شاعری میں تین انحطاطی عناصر رونما ہو گئے تھے یعنی ابتذال۔ افسردگی اور فرسودگی۔

شاعری کے احیا کے سلسلہ میں چند تحریکات شروع ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلا غالب کا طرز شاعری تھا جس پر دماغی کاوش یا فلسفہ کا زیادہ اثر تھا لیکن انھوں نے شاعری کے لئے زبان اتنی مشکل استعمال کی کہ ان کے زمانے میں اسے مقبولیت عام حاصل نہ ہو سکی۔ بعد میں اقبال نے اس کی پیروی کر کے اسے بہت آگے بڑھایا۔ اور آج ملک میں وہ بہت مقبول ہے۔

دوسری تحریک اصلاح مولانا حالی کی تھی۔ یہ تحریک بہت ہمہ گیر اور جامع تھی۔ اس میں غزل کے مختلف پہلوؤں کی اصلاح کی کوشش کی

گئی تھی۔ خیالات کی اصلاح پر خاص زور دیا گیا تھا اور شاعری کے عام مروجہ عیوب پر پوری تنقید کی گئی تھی۔

تیسری تحریک، محمد حسین آزاد کی تحریک تھی۔ اب تک ہماری شاعری بیشتر انسانی جذبات کی ترجمانی تک محدود تھی اور مناظر قدرت کی عکاسی بنیادی طور پر اس میں شامل نہ تھی۔ مغربی خیالات کے نفوذ کے بعد اس تحریک نے بھی زور پکڑا۔ چونکہ مناظر کی عکاسی میں تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے اور ہماری شاعری یا غزل اشارات پر مبنی تھی۔ اس لئے غزل کے بجائے نظم کہنے پر زیادہ زور دیا گیا جسے اقبال نے بہت تقویت پہنچائی اور جوش نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔

اِدھر غزل میں حسرت موہانی کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ حسرت کا قدما کے کلام کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے سب کی خوبیوں سے فیض حاصل کیا اور ابتذال سے بچ کر خالص عشقیہ شاعری بڑے ہلکے پھلکے اور دلکش انداز میں شروع کی۔ پھر فانی نے غالب اور میر کے طرز کو سمو کر بڑی ندرت اور بانکپن سے نہایت موثر انداز میں اپنا کلام پیش کیا۔ ان کے بعد غزل کے میدان میں اصغر اور جگر نے اصلاحی کوششوں کا نمونہ پیش کیا۔ اصغر کے یہاں غالب کے خیالات کے ساتھ شگفتگی تھی اور جگر نے عام غزل میں اسی لے کو بڑھا کر اس میں سرخوشی پیدا کر دی۔ دونوں کا اثر شاعری میں افسردگی پر کافی پڑا

ایسا کہ شاعری کا رنگ ہی بدل گیا۔ گویا اردو غزل میں ایک نئی جان پڑگئی۔ خیالات کی فرسودگی رفع ہوگئی اور طرح طرح کی جدّتیں اور تنوع پیدا ہوگیا۔ خیالات اور طرزِ ادا کے اس موڑ میں جگر کا خاص ہاتھ ہے۔

شاعری میں انفرادیت جگر صاحب کے کلام کی امتیازی خصوصیت ان کے انداز بیان کی رنگینی اور بانکپن، سرخوشی اور شگفتگی ہے۔ خیالات کے اعتبار سے وہ واردات محبت لکھنے کے قائل ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں عشق مجازی نمایاں ہیں جس میں ابتذال کو ذرا دخل نہیں جسن میں ان کے یہاں بھی عورت کا تصور ہے لیکن عورت مجسّم شکل میں ان کے سامنے ہوتی ہے وہ اس کے مختلف اعضاء کا الگ الگ تجزیہ نہیں کرتے۔ وہ ایک بوالہوس عاشق نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کے اس عشق مجازی سے عشق حقیقی کے پایانِ نسائی سے حسن کامل کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔

کسی شاعر کی انفرادیت کو سمجھنے کے لئے تین چیزیں دیکھنا ضروری ہوتا ہے یعنی خیالات۔ انداز بیان یا طرزِ ادا اور زبان۔ زبان اور فن کے معاملہ میں جگر صاحب کی نہ فنی استعداد بہت زیادہ ہے۔ نہ وہ زبان میں مُسلّمہ حیثیت کے مالک ہیں لیکن فن کے تمام مبادیات سے وہ پوری طرح واقف ہیں اور بہت صاف ستھری زبان لکھتے ہیں جو دلکش اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں وہ ذوقِ سلیم کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ قدیم لکھنؤ اسکول

کی طرح وہ زبان کی الجھنوں کے پابند نہیں اور رعایت لفظی تو گویا چڑ ہے۔ ان کے نزدیک خیال اور مضمون کو زبان پر بہر حال مقدم ہونا چاہیئے۔ زبان میں وہ تہذیب اور آداب گفتگو کا بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر محبوب کے لئے "تو" کے بجائے "آپ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً ان غزلوں کی ردیف بھی اس کی شاہد ہے۔

ع۔ جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا

ع۔ اب کسی طرح کی تکلیف نہ فرمائیں آپ

رہی پہلے زمانہ کی انگیا۔ چولی۔ کنگھی۔ چوٹی۔ جوبن۔ بوسہ۔ وصل یار قیب یا

ع۔ وہ الگ باندھ کے رکھا ہی جو مال اچھا ہے

کا تو ذکر ہی نہیں البتہ آئینہ، بوسہ یا وصل اگر کہیں استعمال کیا ہے تو اس کا مفہوم چوما چاٹی یا جنسی تعلق سے ہٹ کر ہی ہے۔ اور رقیب "روسیاہ" کو وہ بقائے عشق کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

ان کا طرز ادا انداز بیاں بہت بانکا۔ نیا۔ دلکش اور پر اثر ہے۔ جب شاعر کوئی غزل سناتا ہے تو کبھی کبھی اس کا مصرع منہ سے بولتا ہوا ہوتا ہے ایسے مواقع پر بے صبر سامعین بے ساختہ دوسرا مصرع یا اس کا قافیہ چیخ اٹھتے ہیں جگر کے ساتھ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سامعین میں سے کوئی صاحب کوئی مصرع یا قافیہ پہلے سے بول پڑے لیکن جگر صاحب نے شعر مکمل کیا تو وہ کچھ کا کچھ تھا۔

اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ جگر صاحب سامنے کی چیز کبھی نہیں اُٹھاتے ہمیشہ روش عام سے ہٹ کر کہتے ہیں اور اتنے انوکھے انداز میں کہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے مثلاً ان کی غزل کا ایک مصرع اولیٰ ہے۔

ع۔ گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں

اب اگر کوئی صاحب چیخ پڑے

ع مصیبت کا زمانہ آ رہا ہے   یا قیامت کا زمانہ آ رہا ہے

تو جگر صاحب مسکرا کر پڑھیں گے

ع۔ محبت کا زمانہ آ رہا ہے

اور سامعین حیرت سے ان کا مُنہ تکتے رہ جائیں گے۔

حسب ذیل اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں جس میں طرز ادا کے لاجواب نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے   غم بھی جس کو راس نہ آئے

کٹے گی شبِ غم بڑی راحتوں سے   تری یاد ہوگی ترا دھیان ہوگا

ظلم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھکو   تیری اس اشک بھری چشم ندامت کی قسم

کرلیا دل نے عیش وصل قبول — پا گیا کچھ شباہت غم کیا

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل — کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

کہاں میں اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق — وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا

صورت دکھا کے پھر مجھے بیتاب کر دیا — ایک لطف آچلا تھا غمِ انتظار میں

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے — جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

جنونِ محبّت یہاں تک تو پہنچا — کہ ترکِ محبّت کیا چاہتا ہوں

یادِ ظالم کو تم اپنی روک لو — لوٹے لیتی ہے مری تنہائیاں

ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا — آخرش کامیاب ہونا تھا

وہ میری طرف بڑھا دے گلچیں — جن پھولوں میں رنگ ہے، نہ بُو ہے

برقِ حوادث اللہ اللہ جھوم رہی ہے شاخ نشیمن

کانٹوں کا بھی کچھ حق ہے آخر کون چھڑائے اپنا دامن

تواضع کر اے عشق چند آنسوؤں سے بہت مسکرانے کو جی چاہتا ہے!

جگر ان حوادث سے گھبرا نہ جانا یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

رہے مضامین اور خیالات تو اس معاملہ میں جگر صاحب نے اردو غزل میں ایک انقلاب کیا ہے۔ مختصراً چند موضوعات یہاں لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ عاشق :۔ مثلاً پہلے اگر عاشق بے حد ستم زدہ۔ لاچار مسکین انتہائی رسوا ذلیل، دربان کی جھڑکیاں سننے والا تھا تو آج اس میں خودداری۔ خود اعتمادی اور وقار پیدا ہو گیا ہے۔ آج وہ بھی ناز سے سر بلند کر کے کہہ سکتا ہے ؎

عشق کی یہ نمود پیہم کیا ہو تمھیں تم تو پھر ہم کیا

ہمیں جب نہ ہونگے تو کیا رنگِ محفل کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا کمی کوئی محسوس فرمائیے گا

پھر اپنے عشق پر اعتماد کرتے ہوئے کہتا ہے۔

عشق کی حد سے نکلتے پھر یہ منظر دیکھتے کاش حسنِ یار کو ہم حسن بنکر دیکھتے

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشق معتبر ہو کر گزر جا ہاں گزر جا حُسن سے بھی بے خبر ہو کر

اب تو اعتماد یہاں تک بڑھ گیا ہے۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے

یا وہ تھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا ان سے کل ان کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

دیکھئے عِشق کی ہمت افزائی کے لئے اس سے بہتر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

عشق ہی کے ہاتھوں نہیں کچھ سکت نہیں رہتی ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

حسب ذیل اشعار بھی اسی نظریہ کے آئینہ دار ہیں۔

خود حسن کی زباں ہو اور داستانِ عشق اپنا بیان درد خود اپنی زباں سے کیا

اور کچھ کمی نہیں آپ کے اختیار میں آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

وہ اور نازِ عشق گوارا کریں مگر اتنے کھنچے ہم ان سے کہ مجبور کر دیا

بالآخر اتنی جرأت بھی ہو گئی۔

ترکِ طلب اور اطمینان　　دیکھ تو میرا حسنِ طلب

جنونِ محبت یہاں تک تو پہنچا　　کہ ترکِ محبت کیا چاہتا تھا

وہ آئے ہیں اے دل ترے کہنے کا یقیں ہے　　لیکن میں کروں کیا مجھے فرصت نہیں ہے

حسرتؔ کہ

دیا ہے عشق نے وہ مرتبہ بحمد اللہ　　کہ آنکھ تک نہ اُٹھاؤں اگرچہ تو آئے

۲۔ **محبوب**:۔ پہلے اگر محبوب بے درد۔ سفاک۔ بے مروت۔ سنگدل۔ رقیبوں کے ساتھ رنگ رلیاں کرنے والا غرضکہ قریب قریب حسن فروش اور عصمت باختہ ہوتا تھا تو آج وہ بھی عام انسانوں کی طرح کا ایک انسان ہے۔ اس کے پہلو میں بھی ایک دل ہے جو محبت سے متاثر بھی ہو سکتا ہے اور عاشق کا درد بھی دل میں رکھتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:۔

اے عشق شاد باش کہ آج انکو بار بار　　مصروفِ احتیاطِ نظر دیکھتا ہوں میں

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی انکی　　ہمنے چھپ کے دیکھا ہے عالم پُر آب ان کا

نہ لٹتے ہم مگر ان مست انکھڑیوں نے جگر　　نظر بچاتے ہوئے ڈبڈبا کے لوٹ لیا

ظلم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو　　تیری اس اشک بھری چشم ندامت کی قسم

میں تو اس چھپنے کے صدقے کہ اب ضد ہی نہیں　　حسن کو عشق کی صورت میں جگر دیکھ نہ لے

بیساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے　　دیکھا نہ گیا حال فقیرانہ کسی کا

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے　　مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

محبت میں عاشق و محبوب دونوں کی کوششیں برابر سے شامل ہوتی ہیں ۔

طے منزلیں ہوئی ہیں یوں عشق و آرزو کی　　کچھ میں نے جستجو کی کچھ اس نے جستجو کی

خود بڑھے آتے ہیں وہ میری طرف　　کوئی دیکھے تو مری پسپائیاں

اور یہ صورت یہاں تک پہنچ گئی ۔

اب تو تاثیر غم عشق یہاں تک پہنچی　　کہ اِدھر ہوش اگر ہے تو اُدھر ہوش نہیں

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری　　کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

اتنی سی بات پر ہے اک جنگِ زرگری — پہلے اُدھر سے بڑھتے ہیں وہ یا اِدھر سے ہم

اب ۔ع۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ کا ثبوت ملنے لگا۔

محبت اصل حقیقت ہے ہکو کیا کرتے — ہم التجا جو نہ کرتے وہ التجا کرتے

کچھ مرے چہرے سے کھلے رازِ عشق — کچھ تری نظروں سے ادا ہو گئے

وہ بھی ہوئے جاتے ہیں طرفدارِ محبت — اچھے نظر آتے نہیں آثارِ محبت

اور اتنا اثر بڑھ گیا کہ

مری موت سنکر کیا اس نے ضبط — مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

بالآخر انتہا ہو گئی۔

جذب جنوں نے آج تو گل ہی نیا کھلا دیا — خود وہ گلے لپٹ گئے عشق کا واسطہ دیا

۳۔ رقیب:۔ محبت کے مثلث کے تیسرے کردار رقیب کو پہلے ہماری شاعری میں "روسیاہ" اور اس لئے کشتنی اور گردن زدنی سمجھا جاتا تھا جگر محبت کیلئے اس کا وجود ضروری سمجھتے ہیں اور ایک دشمن ضروری تصور کرتے ہیں لیکن اسے اس قدر قابلِ توجہ نہیں سمجھتے کہ اسے اپنی شاعری کا مرکزی کردار بنا کر صرف اسی کا رونا روتے رہیں۔ انھیں اس کے مقابلے میں خود اپنے اوپر اور اپنے عشق پر زیادہ اعتماد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جگر کے یہاں رقیب کے متعلق خال خال اشعار ملتے ہیں۔

وہ ہزار دُشمنِ جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

ستم کا عدد مستحق ہو گیا	مرا دل سراپا قلق ہو گیا

غیر جو بر تلخ کام ہے اسکے نصیب کی کمی	مجھ کو تو اک مزا ملا ہر غمِ جانگداز میں

۴۔ **حسن و عشق** :۔ حسن و عشق کے بارے میں جگر کا جو نظریہ ہے وہ آج بہت عام ہو چکا ہے اور اس میں جگر کا خاص ہاتھ ہے۔ اس میں اس وقت تو کوئی جدت یا تنوع نظر نہیں آتا لیکن اگر ہم اپنی قدیم اُردو شاعری کے پس منظر کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ نئی بات معلوم ہو گی۔

جگر کے نزدیک حسن و عشق کا جُدا جُدا کوئی وجود نہیں۔ در اصل یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ایک کو رنگینی۔ دلکشی اور حیا کا حجاب عطا کیا گیا تو دوسرے کو بر ملا وارفتگی اور فدائیت عطا ہوئی۔ ایک کا وجود دوسرے سے قائم ہے۔ حسن کی ہستی عشق کے دم سے ہے اور عشق حسن کی بدولت ہے۔ کبھی عشق خود حسن کو تخلیق کرتا ہے اور کبھی حسن عشق کی تخلیق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس فلسفیانہ بحث کو شاعری کے قالب میں ملاحظہ کیجیے :۔

عشق ہے نصف الحقیقت کیوں پریشاں کیجیے	یعنی ہم پر رحم کر کے خود پر احساں کیجیے

پردہ جب اُٹھ گیا ہو دیکھا یہی ہو اکثر　　اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی

شاید تری نظر سے کچھ رازِ دل سمجھ لوں　　کہتے ہیں عشق جس کو میری زباں نہیں ہے

مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا میں اگرچہ ہوں ترا نقش پا
ترے جلوے جلوے کی ہو بقا مرے شوق نام بنام سے

ہائے وہ حسن کا انداز کہ جس وقت جگر　　عشق کے بھیس میں ہوتا ہو نمایاں کوئی

حسن کے ہر جمال میں پنہاں　　میری رعنائی خیال بھی ہے

حجاب نے انھیں رکھا حجاب میں ورنہ　　جب آتے سامنے اپنا ہی سامنا کرتے

عشق کی حد سے گزرتے پھر یہ منظر دیکھتے　　کاش حسن یار کو ہم حسن بن کر دیکھتے

ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ　　سخت کافر نگاہ ہوتی ہے

تفسیر عشق و حسن جگر مصلحت نہیں　　افشائے راز قطرہ و دریا نہ کیجیے

تو حُسن ہے میں عشق ہوں تو جان ہی میں جسم
کس کی ہے یہ طاقت کہ مجھے تجھ سے چھڑا دے

حُسن سے ہیں عشق کی رُسوائیاں　　بادہ جبتک ہے فروغ جام ہے

۵۔تاریک پہلو روشن کرنا:۔ نیکی اور بدی۔ اچھائی اور بُرائی۔ بدصورتی اور خوبصورتی۔ خوشی اور غم یہ ایک ہی حقیقت کے پرتو ہیں۔ سطح بیں نظریں صرف روشن پہلو پر نظر کرتی ہیں۔ لیکن صاحبِ نظر کے سامنے تاریک پہلو کی بھی وہی قدر و قیمت ہوتی ہے جو روشن پہلو کی۔ اُردو شاعری میں روشن کو تو سب نے نمایاں کیا لیکن تاریک پہلو پر کم توجہ دی گئی ہے۔ جگر نے اسی کو طرۂ امتیاز قرار دیا ہے۔

پہلے اگر شب فراق۔ ع۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ کے مرادف سمجھی جاتی تھی اور اس کے لئے ریاضی داں کو چیلنج کیا جاتا تھا کہ

ع۔ طولِ شب فراق ذرا ناپ دیجیے

اس لئے وہ کسی طرح کاٹے نہ کٹتی تھی تو اب یہ صورت یہ ہے۔

کٹے گی شبِ غم بڑی راحتوں سے　　تری یاد ہوگی ترا دھیان ہوگا

تری صبحِ عیش ہے کیا بلا۔ تجھے اے فلک جو ہو حوصلہ
کبھی کر لے آ کے مقابلہ غمِ ہجرِ یار کی شام سے

تری امانتِ غم کا تو حق ادا کر لوں　　خدا کرے شبِ فرقت ابھی دراز رہے

نہیں جو وصل میسّر نصیب ہجر تو ہے　　ہم اتنے حزن کا ان سے ملال کیا کرتے
اسی طرح غم یا غمِ فراق اک عذابِ جاں ہوتا تھا تو اب راحتِ جاں
گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں　　محبت کا زمانہ آ رہا ہے

صورت دکھا کے پھر مجھے بیتاب کر دیا　　اک لطف آ چلا تھا غمِ انتظار میں

کر لیا دل نے عیشِ وصل قبول　　پا گیا کچھ شباہتِ غم کیا

تسکینِ مضطرب کا مداوا نہ کیجئے　　وعدہ تو کیجئے مگر ایفا نہ کیجئے

کئے مجھ پہ احساں غمِ یار نے　　ہمیشہ کو نیچی نظر ہو گئی

ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے　　غم بھی جس کو راس نہ آئے

خوب رو لے فراق میں اے دل　　کچھ طبیعت سنبھل ہی جاتی ہے

جگر زندگی لُطف سے کٹ رہی ہے　　غم آزاریاں ہیں جنوں کاریاں ہیں

پھر کوئی مہرباں نہ ہو جائے　　سعیٔ غم رائگاں نہ ہو جائے

اسی صورت سے بہار و خزاں۔ گل و خار۔ جفا و وفا اور ستم و کرم میں خزاں
خار۔ جفا اور ستم کے روشن پہلو ملاحظہ کیجیے۔

پھول وہی چمن وہی فرق نظر نظر کا ہے　　عہدِ بہار میں تھا کیا۔ دورِ خزاں میں کیا نہیں

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز　　کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

کانٹوں کا بھی حق ہے آخر　　کون چھُڑائے اپنا دامن

وہ میری طرف بڑھا دے گلچیں　　جن پھُولوں میں رنگ ہے نہ بُو ہے

یار و اغیار سے محبت ہے　　گل تو گل خار سے محبت ہے

ظلم کیا اب تو ستم بھی ہے گوارا مجھ کو　　تیری اس اشک بھری چشم ندامت کی قسم

ستم یار کی دہائی ہے　　نگہ التفات نے مارا

کچھ کہ تو دیا برق غضب نے جسے پھونکا　　اُف کر نہ سکا جس کو ترے پیار نے مارا

یہاں تو کام ہے اک نشتر توجہ سے　　نگاہ قہر رہے یا نگاہ ناز رہے

عشاق پا رہے ہیں ہر جرم پر سزائیں　　انعام بٹ رہے ہیں مغرور ہیں خطائیں

خبر اس کی نہیں ان خام کاران محبت کو　　اسی کو دکھ بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں اسرار نمایاں ہوتے ہیں　　جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

مری طاقت ضبط کی خیر یارب　　کرم پر تلے ہیں ستم ڈھانے والے

محبت بقید وفا چاہتا ہوں   بڑا ناسمجھ ہوں یہ کیا چاہتا ہوں

۶۔ مسائلِ زندگی :۔ غالب نے سب سے پہلے حسن و عشق کے علاوہ عام زندگی سے متعلّق واقعات و حوادث کو شاعرانہ نظریات کی شکل میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی ان کے اشعار پڑھتا ہے اسے وہ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے مماثل نظر آتے ہیں۔ جگر نے بھی اس میدان میں بہت کچھ کہا ہے۔ انکی آخری زمانے کی شاعری میں نفسیات کا یہ پہلو زیادہ نکھر آیا ہے اور اس میں گیرائی اور گہرائی زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ صرف چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم   پیامِ درد دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

اس حسن برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں

اسے صیاد نے کچھ گل نے کچھ بلبل نے کچھ سمجھا
چمن میں کتنی معنی خیز تھی اک خامشی مری

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سمارہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں۔ یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل قفس صورت آشیاں اور بھی ہیں

انکی وہ آمد آمد اپنا یہاں یہ عالم اک رنگ آرہا ہے اک رنگ جا رہا ہے

لبوں پہ موج تبسم نگہ میں برق غضب کوئی بتلائے یہ انداز برہمی کیا ہے

یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ کچھ انہیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

میری ہمت دیکھنا. میری طبیعت دیکھنا جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

اک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

موت کی نیند چھائی جاتی ہے کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا

سینۂ نے پہ جو گزرتی ہے وہ لبِ نے نواز کیا جانے

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا کمی کوئی محسوس فرمائیے گا

ہر اک داغ فرقت کا دھونا پڑیگا تمہیں بھی مرے ساتھ رونا پڑیگا

میرے غم خانۂ مصیبت کی چاندنی بھی سیاہ ہوتی ہے

آجائے اگر ضد پر اپنی کوئی دیوانہ خود گرد پھرے آ کر کعبہ ہو یا بُت خانہ

میں چلوں عشق میں وہ راہ جو ہو سب سے الگ کچھ سجھائی بھی نہ دے سطح بھی ہموار نہ ہو

آرزوئے دل سلامت درد پیہم برقرار آنکھ لگ ہی جائیگی گھبراہٹ جنباں چاہیئے

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی جس طرف دیکھا کیا ۔ دیکھا کیا

کیجئے اور کیا شرح زندگی کچھ سحر، کچھ دوپہر، کچھ شام ہے

جہلِ خرد نے دن یہ دکھلائے گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

غم بھی جسکو راس نہ آئے ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے

جب کوئی آسرا نہیں ہوتا دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے

کچھ طبیعت سنبھل ہی جاتی ہے خوب روئے فراق میں اے دل

فارسی کلام | جگر صاحب نے فارسی میں بھی کافی کہا ہے۔ اپنے دوسرے دور یعنی مین پوری کے قیام تک وہ اکثر فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے ان کا اردو رنگ نکھر کر قائم ہوتا گیا۔ انھوں نے فارسی میں کہنا کم کر دیا۔ میں فارسی کے کلام پر تبصرہ کرنے کی اہلیت اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان کے فارسی کلام میں بھی بڑی دلآویزی اور جاذبیت ہے اور خیالات کے لحاظ سے اس میں بھی انہی خیالات کا عکس پایا جاتا ہے جو انھوں نے اُردو میں ظاہر کئے ہیں۔

منظومات | جگر صاحب غزل کے شاعر ہیں۔ نظم کے شاعر نہیں۔ یوں انھوں نے نظمیں بھی کافی کہی ہیں لیکن ان کی نظموں میں بھی غزلوں کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ان میں وہ بلاغتِ زبان۔ جوشِ زبان اور خیالات کی وہ روانی تسلسل اور پرواز نہیں ہے جو نظم کے لئے ضروری ہے۔ البتہ انکی چند نظمیں بہت مقبول اور اچھی ہیں اور جو رومانی نہیں ہیں ان میں نظم کا رنگ بھی آگیا ہے۔

جگر نے غزل اور نظم کا درمیانی راستہ بھی غزل مسلسل کی شکل میں پیدا کیا ہے جو ملک میں کافی رواج پا گیا ہے۔

جگر اپنے متعلق آخر میں ہم جگر کے چند ایسے اشعار درج کرتے ہیں جن سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اور ان کے شخصی کردار اور ذاتی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے گویا یہ اشعار ان کے خود نوشت حالات ہیں۔

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہر وہی ہے زندگی اپنی
جگر رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

دست کرم بڑھائے جا غیر کی دشمنی نہ دیکھ
ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگر

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اسکو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یار دل کا یار اب بھی
گل تو گل خار سے محبت ہے
یار و اغیار سے محبت ہے

اپنا ہی عکس جس میں اپنا ہی رنگ بھرنا
خون جگر کا حاصل ایک شعر تر کی صورت

محبت ہی اپنا بھی مذہب ہے لیکن
طریقِ محبت جدا چاہتا ہوں

لاکھ رسوا سہی جگرؔ لیکن
خوش نظر بھی ہے خوش خیال بھی ہے

جگرؔ کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق
یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

صرف نقالی ہے مغرب کی جگرؔ
شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

کوئی حسیں حسین ٹھہرتا نہیں جگرؔ
باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

میں نہیں بسملِ خیام جگرؔ
حافظِ خوش کلام نے مارا

میرا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگرؔ
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانہ پہ چھا گیا

مرا شوق بھی مرا ذوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں
مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگرؔ ادب "کثیف" کی جا نہیں

کاریگرانِ شعر سے پُوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

شعلہ سامانیٔ غم پہ نہ کرو ناز جگر
تم سے کتنے ہی جگر شعلہ بداماں ہونگے

عالم تمام میرا ثنا خواں ہوا جگر
میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا

بزمِ مشاعرہ ہے یا گلشنِ تخیّل
بلبل چہک رہی ہے یا حضرتِ جگر ہیں

تیرا دیوانہ غریب جگر
فخرِ ہندوستان ہے پیارے

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہو کر جو اٹھو بے خبر ہو کر

یُوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

نگاہ حضرتِ اصغر کی ہر ودیعت خاص
قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

پابندِ شریعتِ نبی ہوں
خاکِ درِ دولتِ غنی ہوں

کچھ ہم کو نہیں کام جگرؔ اور کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

جانتا ہوں کہ ہوں دراصل میں ننگِ اسلام
کچھ نہ اندیشہ آغاز نہ خوفِ انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام
وہی میخانہ و ساقی وہی بادہ وہی جام
مجھ کو اپنی روشِ خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں

شراب:۔

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے
اور جگرؔ کو شراب نے مارا

کہاں پھر یہ ہستی کہاں ایسی مستی
جگرؔ کی جگر تک ہی مے خواریاں ہیں

کیا جگرؔ سے آپ ابھی واقف نہیں
اک ہی تو رندِ مے آشام ہے

للہ اب تو ذرا ہوش میں آجا
تنگ آ گئے احباب تری بیخبری سے

جگرؔ کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ
جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

دیکھا تھا کل جگرؔ کو سرِ راہ میکدہ — اس درجہ پی گیا تھا کہ نشہ میں چُور تھا

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں مَیں

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے — کہ ترکِ میکشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی

غیر مطبُوعہ کلام میرے پاس جگرؔ صاحب کا کچھ غیر مطبُوعہ کلام بھی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سے چند مکمّل غزلیں یہاں درج کردی جائیں تاکہ آئندہ جب ان کا غیر مطبُوعہ کلام جمع کیا جائے تو یہ کام آئے۔

غم ہی بھی جس کو اک سرور نہیں — زندگی کا اُسے شعور نہیں
دل ہی وہ کیا جو ناصبور نہیں — تو نہ گھبرا ترا قصور نہیں
مجھ کو شکوہ ہے چشم ساقی سے — پی رہا ہوں مگر سرور نہیں
اپنی جنت کی فکر کر زاہد — میری جنت تو مجھ سے دور نہیں

زندگی ہے ترے فراق کا نام!
اور تو زندگی سے دور نہیں

جب تک کہ غمِ انساں سے جگرِ انسان کا دِل معمور نہیں
جنّت ہی سہی دنیا لیکن جنّت سے جہنّم دُور نہیں

جُز ذوقِ طلب، جز شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہو گا کہتے ہیں کہ منزل دُور نہیں

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نُور نہیں

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اس نفع و ضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

ارباب ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے مری
دُنیا سے قیامت دُور سہی دنیا کی قیامت دُور نہیں

پہنچنا زندگی سے زندگی تک
یہ پوچھو خاک پروانہ کے جی سے
بحمد اللہ جنونِ عشق پہنچا
بہت آگے مقامِ آگہی سے
مرا کفرِ محبّت، اللہ اللہ
شعاعیں پھوٹ نکلیں تیرگی سے

خزانے بھر لئے ہیں اہلِ دل نے — ترے مستوں کے دامانِ تہی سے
وہی دل ہی مگر اے حسنِ جاناں — کسے فرصت جہادِ زندگی سے

خبردار، اپنے میخانے سے ساقی
اُٹھے شعلے مرے جامِ تہی سے

صیاد پہ ظاہر ابھی یہ راز نہیں ہے — پرواز، اسیرِ پرِ پرواز نہیں ہے
جو سب کے لئے مونس و دمساز نہیں ہے — کچھ اور ہے وہ عشق کی آواز نہیں ہے
کیا قحطِ محبت ہے کہ اس دورِ ہوس میں — دل باز بہت ہیں کوئی جانباز نہیں ہے

آنکھیں ہیں تو وہ کونسا ذرّہ ہے کہ اے دوست
خود اپنی جگہ انجمنِ ناز نہیں ہے

محبت زندگی ہی زندگی ہے
مگر تجھ بن مرے کس کام کی ہے

وہی ساقی وہی دریا دلی ہے
وہی میں ہوں، وہی لب تشنگی ہے

شہیدانِ محبت سو رہے ہیں!
مگر روحِ صداقت جاگتی ہے

ہوا جاتا ہے ربطِ شوق عریاں
تکلّف برطرف کیا برہمی ہے

بہت جانکاہ ہے بربادیٔ دل
مگر کیا حُسن ہے کیا دلکشی ہے
ہٹو رستے سے اے شیخ و برہمن
مرے دل نے مجھے آواز دی ہے

کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ وشی ہے
رونا ہے تو رونا ہی ہنسی ہے تو ہنسی ہے
ہر چند کہ تکرارِ نظر بے اَدبی ہے
پر کیجئے کیا، عشق کی فطرت ہی یہی ہے
بن جاؤں نہ بیگانۂ آدابِ محبت
اتنے نہ قریب آؤ مناسب ہی یہی ہے
وہ ظلم بھی ڈھاتے ہیں تو فرماتے ہیں احساں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو خاطر شکنی ہے
یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن
جب دیکھئے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

آساں نہیں ہے جہدِ مسلسل سے گزرنا
ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے

منصور ہر اک دور میں بیدار ہوا ہے
افسانہ کہیں ختمِ سرِ دار ہوا ہے

مدّت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے
تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے

کیا کیا نہ تپایا ہے اسے آتشِ غم نے
تب جا کے یہ دل شعلۂ بیدار ہوا ہے

فیضانِ غمِ عشق سے حاصل ہے وہ نسبت
ہر سانس حدیثِ لب و رخسار ہوا ہے

کچھ دل کا تقاضا ہی تھا "عرضِ محبت"
کچھ ان کی نگاہوں کا بھی اصرار ہوا ہے

شبنم کی نظر میں نہیں تخصیص کسی کی
سیراب ہر اک پھول ہر اک خار ہوا ہے

اب حسن سے کچھ کام نہ جلووں سے سروکار
اب عشق ہی خود عشق کا معیار ہوا ہے

بے شاہد و ساقی بھی کبھی پی تو ہے لیکن
جو گھونٹ بھی اترا ہے وہ تلوار ہوا ہے

کیا کہیے جگر کس گلِ رعنا کی بدولت
ہر شعر مرا شعلۂ رخسار ہوا ہے

آہ جگر!

آہ جگر!

رئیس المتغزلین رحلت فرما گئے۔ اُردو غزل کا سہاگ اُجڑ گیا، اُردو زبان بے یار و مددگار ہو گئی۔ اُردو غزل میں جگر کا موقف کیا تھا۔ جگر نے اپنے خونِ جگر سے اسے کس طرح سینچا۔ یہ تو اردو کا مورخ آگے چل کر بیان کریگا اور نقادِ جگر کے تمام شاعرانہ پہلوؤں کو اُجاگر کرے گا لیکن اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال زیادہ اہم نہیں ہے کہ اُردو غزل کا شہنشاہ، اردو شاعری کی جان اور اُردو ادب کا سرتاج اُٹھ گیا بلکہ سوال یہ ہے کہ ایک بہت بڑا انسان لاکھ انسانوں کا انسان ہمیں داغِ مفارقت دے گیا ؎

وہ حلم وہ تواضع اور وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا

اس وقت یہ طے کرنا واقعی مشکل ہے کہ جگر ایک عظیم شاعر تھا یا ایک عظیم انسان۔ واقعی وہ انسان سے بڑا شاعر اور شاعر سے بڑا انسان تھا۔ بڑے لوگوں میں تو بہت سے لوگ گزرے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے لیکن بڑا انسان وہ

ہے جس میں "مردِ مومن" کی تمام خصوصیات موجود ہوں اور چونکہ جگر کا کردار مردِ مومن کی تمام خصوصیات کا آئینہ دار تھا اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ واقعی جگر بہت بڑا اور سچا انسان تھا۔ ان کے کردار کا یہی عکس اور ان کی یہی تصویریں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔

۱۹۵۸ء میں جگر صاحب پر دِل کا دورہ پڑا۔ لکھنؤ کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ کافی عرصے علاج ہوتا رہا۔ افاقہ تو ہو گیا لیکن دورے کی نوعیت کچھ اتنی شدید تھی کہ اس کے بعد سے بالکل صاحبِ فراش ہو گئے۔ کچھ عرصے گونڈے میں رہتے پھر دورے کا اعادہ ہوتا تو لکھنؤ آ کر اسپتال میں داخل ہو جاتے ان کے عزیز دوست حقی حزیں ایم اے رحلت فرمانے سے دو روز قبل ان کی عیادت کو گئے تھے اور رحلت کے ۱۹ گھنٹے قبل تک وہیں تھے انھوں نے اپنے تاثرات الجمیعۃ دہلی میں لکھے ہیں جو بجنسہٖ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

"چنانچہ ۷ ستمبر کی دوپہر کو لکھنؤ سے گونڈہ کے لئے روانہ ہو گیا اور تقریباً ساڑھے پانچ بجے شام اس مقدس بارگاہ کے دروازہ پر حاضر تھا جس کی کشش مجھے کشاں کشاں لے آئی تھی، اور جو جگر لاج کے نام سے موسوم ہے۔

میں نے دیکھا کہ حضرت کی نگاہیں دروازہ پر لگی ہوئی ہیں اور برقی پنکھے کے مقابل متعدد تکیوں کے سہارے پلنگ پر اس طرح جھکے ہوئے بیٹھے ہیں

جس سے صاف ظاہر تھا کہ لیٹے سے بدقّت تمام اُٹھ کر بیٹھ گئے ہیں حضرت کے جسمِ لاغر پر جو کبھی کافی فربہ تھا، ایک جالی کا سفید بنیان اور سبز رنگ کا تہ بند تھا۔ جیسے ہی میں قریب پہنچا اور سلام عرض کیا حضرت نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سلام کا جواب دیتے ہوئے میرے ہاتھوں میں اپنے کمزور اور نحیف ہاتھ دے دیئے اور آپ نے بیٹھنے کے لئے فرمایا۔ میں نے تعمیل حکم کی اور عرض کیا کہ حضرت ایک عرصے سے آرزو تھی کہ حاضر ہو کر مزاج پُرسی کروں۔ تسکین صاحب بھی تشریف لاتے مگر وہ عین وقت پر علیل ہو گئے اس لئے میں تنہا ہی حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے اور حفیظ صاحب نے آپ کو سلام عرض کیا ہے۔ فرمایا "تسکینؔ صاحب نے جو کچھ آپ کے اور اپنے بارے میں لکھا تھا وہ مجھے بتایا جا چکا ہے لیکن مجھے اُمید نہیں ہے کہ اب اُن سے ملاقات ہو سکے گی۔" میں نے گھبرا کر عرض کیا کہ "آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ انشاء اللہ ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں یہاں سے واپسی پر انھیں آپ کی حالت سے مطلع کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اب تک ٹھیک ہو چکے ہوں گے اور فوراً آپ کے پاس آجائیں گے۔"

اسی دوران میں حضرت کے برادرِ خورد علی مظفر صاحب باہر سے آگئے مظفر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ آپ انھیں جانتے ہیں میں نے عرض کیا کہ جب آپ دہلی سے اپنی کتاب پر انعام لیکر میرٹھ گئے تھے

تو یہ آپ کے ہمراہ تھے۔ فرمایا ٹھیک ہے۔ میں اجازت لے کر کمرے سے باہر آیا اور ضروریات سے فارغ ہو کر پھر حاضر خدمت ہوا تو چائے مع لوازمات کے موجود تھی۔ حضرت نے نہایت شفقت کے ساتھ فرمایا کہ پیجیے۔ چائے سے فراغت ہوتے ہی مجھ سے جناب حکیم سیف، قاری یونس اور حفیظ صاحب کی نام بنام خیریت دریافت کی اور میں حضرت کے اس خلوص و محبت پر دنگ رہ گیا کہ اس حال میں بھی وہ اپنے احباب کو نہیں بھولے اور ہر ایک کا انھیں کس درجہ خیال ہے۔ حضرت اپنی اندرونی تکلیف کی بنا پر مسلسل کراہ رہے تھے اور ان کی حرکات و سکنات سے سخت بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں انھوں نے مظفر صاحب سے کوئی دوا طلب کی اور اس کے پانچ منٹ بعد پھر کوئی دوسری دوا طلب فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت دوا دوا کے درمیان کچھ وقفہ ہونا چاہیے۔ اتنی جلدی جلدی آپ کیوں دوائیں استعمال فرما رہے ہیں۔ فرمایا کہ جی نہیں، پیٹینٹ دوائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میں نے حضرت کی بڑھتی ہوئی بے چینی دیکھ کر معلوم کیا کہ آخر آپ کو کیا تکلیف ہے، کیا کسی قسم کا درد محسوس ہوتا ہے۔ فرمایا۔ جی درد بھی ہے اور اس کے علاوہ نہ معلوم کیا کچھ ہے۔ پھر مظفر صاحب کو آواز دی اور ان کے کمرے میں آنے پر ان سے فرمایا کہ تم ہر وقت میرے پاس رہا کرو۔ مجھ سے کہے بغیر کہیں نہ جایا کرو۔ پھر فرمایا کہ ادھر آؤ اور سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا کہ ذرا یہاں دباؤ۔ وہ

حضرت کے پلنگ پر بیٹھ کر دبانے لگے۔ پھر کسی ضرورت سے اُٹھے تو میں نے ان کی جگہ لے لی اور آہستہ آہستہ سینہ و کمر دبانے لگا۔ اب حضرت نے بجائے آہ، آہ کے اللہ، اللہ کرنا شروع کر دیا اور تا دیر یہ سلسلہ جاری رہا۔

پھر حضرت نے مظفرؔ صاحب سے فرمایا کہ اچھا بیوی کو یہیں بھیجدو۔ اور میری جانب دیکھتے ہوئے فرمایا کہ آپ ذرا باہر چلے جائیں۔ میں فوراً باہر چلا آیا اور اسی کمرہ سے متصل مردانہ کمرہ میں جا بیٹھا۔ بیگم جگر ان کے پاس پہنچ گئیں اور حضرت کی آواز ان کی کھانسی اور کراہ کے درمیان برابر آتی رہی۔

مظفر صاحب میرے پاس آ بیٹھے اور حضرت کی کیفیت بیان کرنے لگے کہ ایک عرصہ سے یہی حال ہے۔ ڈاکٹروں نے شروع میں ضرورتاً انجکشنوں کا استعمال کیا تھا، مگر اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ ان کا زیادہ استعمال ان کے حق میں مضر و مہلک تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن حضرت اب انھیں انجکشنوں کے عادی ہو کر رہ گئے ہیں اور تا وقتیکہ ان کے انجکشن نہ لگ انھیں چین نہیں آتا۔ روزانہ انجکشن لگواتے ہیں اور گھر والوں نیز ڈاکٹروں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ انجکشن لگایا جائے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت نے مظفرؔ صاحب کو پھر آواز دی اور ان سے جو کچھ کہا اس کا اعادہ کرتے ہوئے میرا دل روتا ہے اور میں

سوچتا ہوں کہ آیا فی زمانہ اس مجسمۂ اخلاق و محبت کا ثانی کوئی ہو سکتا ہے حضرت نے مظفر صاحب سے فرمایا جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ حقی کی خاطر تواضع کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ فلاں فلاں مقامی شعراء کو اطلاع کرا دو اور حیرت صاحب کو بُلا لاؤ تاکہ یہ لوگ شعر و سخن کے ذریعہ ان کا دل بہلائیں۔

یہ بات میرے علم میں آئی تو میں اپنی جگہ یہ سوچ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ اللہ اللہ کیا شفقت و محبت اور کیا دلداری و دلدہی ہے کہ خود تو حال سے بے حال ہیں مگر دوسروں کی اس درجہ پاسداری ملحوظ ہے۔

بہرحال میں نے مظفر صاحب سے نہایت صفائی اور سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا کہ وہ ہرگز ایسا نہ کریں اور حضرت سے میری جانب سے کہہ دیں کہ میں ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا ہوں نہ کہ محفلِ شعر و شاعری برپا کرانے۔ شکر ہے کہ میرے منع کرنے پر پروگرام منسوخ کر دیا۔ اسی وقت حضرت کے ایک کرم فرما اجتبیٰ علی صاحب سب رجسٹرار تشریف لے آئے اور مظفر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ رجسٹرار صاحب حضرت کی ڈاک وغیرہ کے انچارج بھی تھے اور ان کے علم میں میرا گونڈہ کا پروگرام تھا۔ انھوں نے میری آمد پر مسرت اور حضرت تسکینؔ کی نا وقت علالت و معذوری پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور مظفر صاحب سے حضرت کی کیفیت دریافت کرنے لگے۔ میں اسی کمرہ میں بیٹھا رہا اور وہ حضرت کے پاس چلے گئے۔ پھر مظفر صاحب کو اپنے

ہمراہ لیتے ہوئے ڈاکٹر کے مطب کا رُخ کیا۔ میں ایک نوجوان طالب علم سے جو حضرت کے پڑوسی معلوم ہوتے تھے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد رجسٹرار صاحب واپس آگئے اور حضرت کے کمرہ میں چلے گئے۔ مظفر صاحب میرے پاس بیٹھ گئے اور بتانے لگے کہ ڈاکٹر مصروف ہے، فارغ ہونے پر آئے گا۔ رجسٹرار صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے میری گھڑی لیکر پھر حضرت کے کمرے میں گئے اور ان کی نبض کی رفتار کا اندازہ کرنے لگے۔ پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور بتایا کہ نبض کی رفتار کی ,, حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بولے کہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ میرے نہایت مخلص دوست ہیں اور بہت اچھا کہتے ہیں یہ سنکر میں حضرت کے اخلاق اور ان کی شفقت و محبت کے بارے میں سوچتا رہ گیا کہ انھیں اپنے نیازمندوں سے کتنا تعلق ہے اور ان کا وہ نئے ملنے والوں سے غائب وحاضر کس قدر اچھے الفاظ میں تعارف کراتے ہیں۔ رجسٹرار صاحب دو تین بار پھر مظفر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئے کیونکہ حضرت کی بےچینی برابر بڑھتی جارہی تھی اور آخر ایک بار ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لے ہی آگئے۔ اسی وقت خانساماں نے میرے سامنے کھانے کی ٹرے لاکر رکھی میری تمامتر توجہ ڈاکٹر کی آمد کی طرف تھی اور میں بھی کمرہ سے باہر آکر ڈاکٹر کے قریب کھڑا ہوگیا، جہاں انجکشن تیار کیا گیا۔ اور آخر حضرت کے لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر کی

واپسی کے فوراً بعد ہی حضرت کو سکون ہو گیا اور وہ غافل ہو گئے

میں نے مظفر صاحب کے ساتھ کھانا کھایا جو کافی اہتمام کے ساتھ تیار کرایا گیا ہوگا۔ کھانے کے دوران میں مظفر صاحب نے بتایا کہ اب ہم آپ سب کے سونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں ورنہ تو رات جاگتے ہی گزرتی۔ اس وقت تقریباً نو بجے تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد مظفر صاحب نے میرے سونے کا اسی کمرہ میں بندوبست کر دیا اور خود حضرت کے کمرہ کے بالکل برابر پلنگ بچھا کر لیٹ گئے تاکہ اگر حضرت کسی وقت بیدار ہوں تو وہ گوش بر آواز رہیں۔ حضرت کے کمرہ میں جو خاموشی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انجکشن لگنے کے بعد سے غافل سو رہے ہیں۔ کبھی کبھی جو خفیف سی آہٹ ہوتی تھی وہ بیگم صاحب کی موجودگی کا پتہ دیتی تھی۔ آخر دس بجے کے بعد میں سو گیا۔

صبح ناشتہ کے دوران مظفر صاحب نے بتایا کہ بیگم جگر کا خیال ہے کہ حضرت کو کبھی کبھی اناج بھی استعمال کرانا چاہیئے۔ ڈاکٹر نے تو صرف موسمی کا عرق اور دودھ غذا میں بتا رکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس وقت کچھ اسی قسم کی چیزیں انھیں کھلا رہی ہیں اور حضرت ایک ایک لقمہ بڑے تکلف کے ساتھ کھا رہے ہیں۔

ناشتہ کے بعد پان اور سگریٹ کا شغل جاری ہی تھا کہ میرے کانوں میں بیگم صاحبہ کی آواز آئی کہ انھیں بلا لیجیے۔ اور ان کے کمرے کے اندر دی

حصّے میں جانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ مظفر صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ آیئے
میں ایک مرتبہ پھر دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ حضرت کے کمرہ
میں داخل ہوا۔ یہ میری دوسری باریابی تھی۔

واپسی کے وقت میں نے اطلاع کرائی کہ جارہا ہوں اور رخصتی سلام
عرض کرنے کے لئے آنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت مظفر صاحب بھی بازار
سے ترکاری وغیرہ لئے ہوئے واپس آئے اور انھوں نے مجھے اشارہ کیا کہ
آجائیے۔ یہ میری تیسری حاضری تھی اور اس مرتبہ میں یہ ٹھان کر گیا تھا کہ
اپنے دلی جذبات واحساسات کا پورے طور پر حضرت پر اظہار کردوں گا۔
چنانچہ دل ہی دل میں بسم اللہ کہہ کر حضرت کے کمرے میں داخل ہوا۔ مظفر
صاحب میرے پیچھے پیچھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت اس وقت آنکھیں
بند کئے ہوئے بستر پر دراز تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ہونٹ شدت
جذبات سے کانپ رہے تھے۔ اس کیفیت کی طرف مظفر صاحب نے
مجھے متوجہ کیا اور خود انھوں نے آواز دی کہ بھائی صاحب! حزیں صاحب
رخصتی سلام کے لئے حاضر ہیں۔ حضرت نے آنکھیں کھولیں تو وہ تمام آنسو
جو پلکوں پر رکے ہوئے تھے ڈھلک کر رخساروں پر آگئے۔ یہ عالم دیکھ کر
میرا بے اختیار جی چاہا کہ چیخ مار کر رو پڑوں۔ مگر میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا۔
اور حضرت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر عرض کیا کہ حضرت! ذرا اپنا دل

قوی رکھئے۔ ہم سب نیازمند آپ کے لئے شب و روز دعائے صحت کرتے ہیں کہ خدا وہ دن دکھائے کہ آپ تندرست ہو جائیں اور پھر آپ کے قدم میرٹھ آئیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے لیے مرگ مستعجل کی دعا کیجیے، صحت کی نہیں۔

میں اپنی دیرینہ آرزو کا اظہار کرنے ...... بھی نہ پایا تھا کہ حضرت نے خود ہی فرمایا کہ آپ جانتے ہیں رسمی استادی شاگردی کو میں کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا۔ ویسے آپ کو میری ذات سے جو محبت اور یک گونہ نسبت ہے آپ کے لئے وہی کافی ہے۔ میں آپ کو اور آپ کے دوسرے ساتھی ...... میں نے کہا حفیظ صاحب، فرمایا ہاں! حفیظ صاحب، دونوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ میں نے اپنی باقی ماندہ بات کو پورا کرنے کے لئے عرض کیا کہ میرا مقصد اس وقت استادی شاگردی کا تذکرہ چھیڑنا نہیں تھا بلکہ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ مجھے اپنی کوئی چیز بطور تبرک و یادگار عنایت فرما دیں تاکہ وہ میرے پاس ہمیشہ رہے اور وہ اگر آپ کی ٹوپی ہو تو کیا اچھا ہو، مگر ٹوپی وہ ہو جسے آپ عرصے تک استعمال کر چکے ہوں۔

آہ! میری اس درخواست پر آپ کے جو الفاظ میرے کانوں نے سُنے وہ تا دمِ مرگ میں فراموش نہ کر سکوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی میں اپنی ہر دُنیادی چیز کو اپنے سے جُدا کر چکا ہوں اور اب اس دنیا میں میرا کچھ بھی نہیں ہے تاہم آپ کی خواہش کا احترام ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ آیا وہ تسکین صاحب سے کچھ کہلوانا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میں نے عرض کیا خیر میں خود ان سے سب کچھ کہہ دوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ بہو کو میرا سلام کہنا۔ میں نے عرض کیا کہ بہتر ہے اور حضرت پر ایک رخصتی نظر ڈالتا ہوا سلام عرض کر کے ان کے کمرے سے باہر آ گیا۔

مظفر صاحب باہر آئے تو میری حیرت و مسرت کی حد نہ رہی جب میں نے انھیں حضرت کی ٹوپی ہاتھ میں لئے آتے دیکھا۔ میں نے وفور شوق میں جھپٹ کر ان سے اس ٹوپی کو لیا اور بے اختیار اسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اور میں انھیں سلام کر کے حضرت کی ٹوپی کو جو میرے لئے گنج معانی ہے سینے سے لگائے لکھنؤ واپس آ گیا اور اسی روز رات کی گاڑی سے میرٹھ کے لئے روانہ ہو گیا۔

اب جگر کے آخری لمحات اور آخری سفر کے حالات سید اجتبیٰ علی صاحب علوی کی زبان سے سنئے :-

"یوں تو جگر صاحب کی علالت کا سلسلہ چار سال سے تھا مگر انتقال سے تین ہفتے قبل وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ انتقال کے دس بارہ دن قبل سے یہ بات پیدا ہو گئی تھی کہ اپنی یادگار کے طور پر لوگوں کو چیزیں عنایت فرماتے تھے۔

۳۱ اگست کی شام کو جب میں حاضر ہوا کہ میرا حساب ایک پرچہ پر لکھ دیجئے۔ بیگم صاحبہ روپے لائیں۔ مجھے پرچہ لکھوایا، تاکید کر کے تاریخ ڈلوائی۔ روپیوں کی تعداد لفظوں میں لکھوائی۔ بیگم صاحبہ سے فرمایا آپ

رکھ لو۔ اس دن تحویل میں کُل ۳۸۰۰ روپے تھے، ۱۲ ستمبر تک ۹۰۰ روپے صَرف ہوئے۔ مصارف تعمیر قبر کے لئے ۵۰۰ روپے رکھے گئے اور ۵۰۰ روپے بیگم صاحبہ کو خرچ خانگی کے لئے دے گئے اور بقیہ ۹۰۰ روپے کی تقسیم بطور مساوی بیگم صاحبہ اور مظفر صاحب میں تسکین صاحب کے ہاتھوں ہوئی۔ بنک میں جگر صاحب کا ۵۰۰ روپئے اور ڈاکخانہ میں ۵۰ روپے جنکی وصولیابی کے لئے سرٹیفکٹ حاصل کیا جائیگا

۴ ستمبر کو میرے متعلق فرمایا کہ وہ بھی آجائیں تو ایک تحریر لکھوا کر اخبارات میں اس مضمون کی بھیجدی جائے کہ جملہ احباب ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں۔

۸ ستمبر کی شام کو میں قریب، ۴½ بجے پہنچا۔ دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا آپ آگئے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ ملایا تو فرمایا "الوداعی سلام ہے پیارے" میرے عرض کرنے پر کہ میں ابھی آپکا الوداعی سلام لینے کو تیار نہیں ہوں۔ فرمایا طبیعت خراب ہے۔ کچھ دیر بعد ہی بیگم صاحبہ سے فرمایا "آجکل ہم بہت چڑچڑے ہو گئے ہیں معاف کرنا" ۸ ستمبر کی رات میں میں ۹½ بجے تک بیٹھا۔ باتیں کرتے رہے چائے منگوائی خود نوش فرمائی۔ بیگم صاحبہ کو اور مجھے پلوائی اور جب انھیں غنودگی آنے لگی تب میں اُٹھا۔

اس رات بالکل باہوش تھے انجکشن لگوانے کا اصرار کرتے۔ مگر اس رات نہیں لگوایا گیا۔ رات کے دو بجے تک کچھ سوتے کچھ جاگے۔ دو بجے سے ۴½ صبح تک اطمینان سے سوئے، ۴½ بجے جاگے تو بیگم صاحبہ اور مظفر صاحب کو جگایا اور چائے کی فرمائش کی چائے بنوائی گئی۔ خود نوش فرمائی۔ بیگم صاحبہ اور مظفر صاحب کو پلوائی، ۵½ بجے کے کچھ دیر بعد فرمایا "اُلجھن ہو رہی ہے ڈاکٹر کو بلاؤ" مظفر صاحب ڈاکٹر کو بُلانے گئے جو ۱۰۰ قدم پر رہتے ہیں، اس درمیان میں دو تین ادھی ادھی سانسیں لیں اور رحلت فرما گئے۔ انا للہ۔

انتقال سے ۱۰، ۱۲ دن قبل یہ وصیت فرمائی تھی کہ غسل علی حسین ملازم حضرت اصغر مرحوم اور مولوی عبدالباری دیں گے۔ چنانچہ غسل ان دونوں نے اور ضمیر صاحب نے دیا۔ مابین عصر و مغرب باغ یحییٰ (جو جگر صاحب کے مکان سے دو ڈھائی سو گز پر واقع ہے اور جس میں شہر کے اندر واقع ہونیکی وجہ سے سو سال سے کوئی تدفین نہیں ہوئی تھی) دفن ہوئے۔ جنازے کے ساتھ ۵، ۶ ہزار کا مجمع تھا۔ اس دن ایک بجے سے جملہ دفاتر بند کر دیئے گئے۔ تمام مدارس صبح ہی سے بند ہو گئے تھے اور صبح سے شام تک ہزارہا آدمی آخری دیدار کے لئے بے تابانہ آتے رہے۔ تدفین کے وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور جملہ افسران بلا تخصیص قوم و ملت موجود تھے۔ نماز جنازہ دوبار ہوئی۔ آخری نماز میں متعدد حضرات لکھنؤ شریک ہوئے۔ یہاں ایک فوٹوگرافر نے تکفین کے بعد جگر صاحب کی تصویر لی اور متعدد تصاویر تدفین کی لیں۔

پیشین گوئیاں | جگر صاحب کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے جو اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا کہ جگر صاحب کا انتقال ۹ ستمبر کو ۹۔ اور ۱۰ بجے کے درمیان ہوا ہے۔ اس روز صبح ۵ بجے انھوں نے اپنے بھائی علی مظفر کو جگایا اور کہا کہ چائے بناؤ۔ چائے تیار ہوگئی تو خود پی اور بھائی اور بیوی کو پلوائی۔ چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد پوچھا "کیا بجا ہے"۔ کہا گیا "۵ ½" اس پر جگر صاحب نے جواب دیا "وقت گزر رہا ہے اور میں ۹، ۱۰ بجے کے بعد زندہ نہ رہوں گا"۔ چنانچہ ۹، ۱۰ بجے کے درمیان دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

جگر صاحب سے عقیدت رکھنے والے احباب اپنے طور پر اس واقعہ کی کچھ بھی توجیح کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جگر صاحب نے اپنے انتقال کے متعلق بہت سے اشعار کہے ہیں جو پہلے تو صرف ادب پارے معلوم ہوتے تھے لیکن اب صریح پیشین گوئیاں ثابت ہو رہی ہیں۔ اس نظر سے ان کو اس سے پہلے دیکھنے کو طبیعت آمادہ ہی نہ ہوتی تھی لیکن اب روز روشن کی طرح حقیقت بن کر سامنے آگئی ہے ؎

موت کی نیند چھائی جاتی ہے ۔۔۔ کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر ۔۔۔ عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے ۔۔۔ مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
اک سانحہ تو ہے مگر اتنا اہم نہیں

دل کو سکون روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

قیدِ ہستی سے کب نجات جگر
موت آئی اگر حیات گئی

خوشا حیاتِ عاشقاں کہ موت بھی جب آئی ہے
تو ساتھ ایک حلقۂ پری وشاں لئے ہوئے

احباب مجھ سے قطع تعلّق کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

وہ حلم وہ تواضع وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا

مری موت سُن کر کیا اُس نے ضبط
مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

قریبِ منزلِ ہستی ہی الفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند چھائی جاتی ہے

قطعاتِ تاریخ جگر صاحب کے سانحہ ارتحال پر بلا مبالغہ برصغیر پاک و ہند میں صدہا نظمیں، قطعات تاریخ وغیرہ کہے گئے ہیں اور کہے جاتے رہیں گے۔ مظفر جلیس صاحب شوق نے ناظم آباد کراچی سے اعلان کیا ہے کہ وہ ان سب کو جمع کر کے شائع کریں گے۔ ہم یہاں صرف چند قطعات تاریخ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

قطعۂ تاریخِ وفات اور تاریخی مادّے

جگر مرادآبادی	"شہریارِ ملکِ سخن علی سکندر"	"صدرِ بزمِ غزل"
	۱۹۶۰	۱۳۸۰ھ

منظر صدیقی سیمابی اکبرآبادی

آہ! دنیا سے ہوئے رخصت جگر — سانحہ یہ ہے بڑا ہی بے پناہ
نو ستمبر کو گئے سوئے جناں — کر گئے خالی ادب کی بارگاہ
چھپ گیا اک آفتابِ علم و فن! — ہے فلک بے نور و بے رنگ و سیاہ
ماہتابِ دنیئے شعر و ادب — ہو گیا مدفون زیرِ خاک آہ
"یاد کی فریاد" کس سے کیجیے — رو رہا ہے دل، فسردہ ہے نگاہ
کیا بجھے گا "شعلۂ طور" جگر — اور نکھرے گا بہ رنگِ مہر و ماہ
میں کہ اے منظر ہوں دلگیر و ملول — مطلقاً اس میں نہیں ہے اشتباہ

ارتجالاً یوں کہی تاریخِ مرگ
خلد میں پہونچے غزل کے بادشاہ

۱۳۸۰ھ

محشر بدایونی

کشتۂ عالمِ سفر کا داغ | شام کا داغ اور سحر کا داغ
قلبِ اہلِ ہنر میں سوزاں ہے | آج اک صاحبِ ہنر کا داغ
ہر نشانِ قدم ہے اب اس کا | سینۂ خاکِ رہگذر کا داغ
غمِ مرگ اس کا ہر نفس کا غم | داغِ ہجر اس کا عمر بھر کا داغ
بن گیا شمعِ علم و فن کا سکوت | بزمِ یارانِ نکتہ ور کا داغ
ہے دلِ دوستاں میں شعلہ فشاں | جگرِ مہرباں نظر کا داغ

انتقالِ جگر کی ہے تاریخ
نقش ہر دل پہ ہے جگر کا داغ

۱۹۶۰

از نشتر بلرامی

کیا خبر تھی ان کو ہم یوں کھوئیں گے | عمر بھر جن کے لئے سب روئیں گے
یاد آئے گا انھیں گونڈہ ضرور | جب جگر خلد بریں میں سوئیں گے

۱۳۸۰ھ

قدرِ مردم، بعدِ مردم سچ ہے اے اہلِ نظر | اہلِ دل اب کہہ رہے ہیں ہائے یہ کیا ہو گیا
بن گئی ہے آج دنیائے ادب ماتم کدہ
گلشنِ انسانیت لے حشر برپا ہو گیا

۱۹۶۰

دار فانی سے کرنا تھا ان کو سفر
اُٹھ گئیں وہ تغزل کی رعنائیاں

چشم حیرت سے تکتے رہے چارہ گر
سو رہے باغ فردوس میں اب جگر

۱۹ ۶ ۰

نشتر بلرامی

از حکیم عزیز قدوسی کاملوی

چل بسا دہر سے وہ اہلِ نظر
اہلِ علم و ادب کے دل کو عزیز

جس نے سمجھائے زندگی کے نکات
آہ تڑپا گئی جگر کی وفات

۱۳ ھ ۸۰

شمیم صابری متھرادی

بلند فکر شاعر جگر مرادابادی کی وفات

۱۹ ۶ ۰

جان ہی دیدی جگر نے جب بحکم ربّ شمیم
آئی ملہم کی بھی بالین جگر سے یہ صدا

۳۱۶

نالہ غم ہونٹ پر بے اختیار آہی گیا
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آہی گیا

۱۹۶۰ = ۳۱۶ + ۱۶۴۴

از ایس محمود حسن آرٹسٹ میرٹھی

فخر سر خیل غزل گویاں جگر کیا چل بسے
مصرعہ تاریخ از خونِ جگر محمود لکھ

آسمانِ شاعری کے چھپ گئے شمس و قمر
رہروِ جنت ہوئے تیرہ سو اسّی میں جگر

۱۹ ۶ ۰

از محمد مکرم بھوپال

وہ تو اسی میں خوش تھا یارب — یوں سر آنکھوں پر حکمِ اجل
رضواں کی جنّت اپنی جگہ — فردوس جگر - فردوس غزل

۱۹۶۰

الوداع و الوداع و الوداع — اے مجسّم شعر اے معجز بیاں
الفراق والفراق و الفراق — اے جگر اے شاعر جنّت مکاں

۱۳۸۰ ھ

میرے عزیزِ محترم یوں تری جو خوشی مگر — سب یہ تکلفات ہیں انکی طرف نظر نہ کر
مجھ کو تو فن کی فکر ہے سالِ وفات کے سوا — بہرِ خدا غزل سُنا - تعزیت جگر نہ کر

۱۹۶۰ — ۱۳۸۰ ھ

آمد بسوئے جگر پیامے — کائے جزو اہم زجوہر کل
تا چند بقید اے عناصر — مانی ہمہ ہمصفیر اے بُلبُل
درآ بقضائے قدس رقصاں — باشعلۂ طور و آتشِ گُل

۱۳۸۰ ھ

غالب کی زبان سے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۶۳۵ — ۷۴۵

از حاجی اصطفا خاں صاحب اصطفا لکھنوی

حج و زیارت کر کے گئے　　تھے جو کبھی اِک شاعرِ رِند
سالِ وفات آصف لکھئے　　حیف جگر اے حافظِ ہند

۱۳　ھ　۸۰

صد حیف اس جہاں سے جگر نے سفر کیا　　وہ کون دل ہے جس پہ کہ غم کا اثر نہیں
جس نے غزل میں ایک نئی روح پھونک دی　　اس کو ملی حیات اُسے مرنیکا ڈر نہیں
تاریخ ارتحال یہ اے اصطفا لکھو
مرگِ غزل دِلا ہے یہ مرگِ جگر نہیں

۱۳　ھ　۸۰

وہ سوئے جناں اس جہاں سے گئے　　نہیں اب وہ ایدل۔ جہاں میں نہیں
خدا اپنے آغوشِ رحمت میں لے　　رہیں خاص بندوں کے وہ ہم قریں
لِکھو اصطفا انکی رحلت کا سال
جگر بزم آرائے خلدِ بریں

۱۳　ھ　۸۰

اعتراف خدمات حکومتِ ہند نے ہندی نوازی کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے بہی خواہانِ اُردو کو طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن جگر صاحب کے معاملہ میں حکومتِ ہند نے اُردو نوازی کا جو ثبوت دیا ہے وہ حیرت انگیز اور قابل صد ستائش ہے۔ لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جگر صاحب کی ذات اور انکے پر خلوص اور بے ریا رویہ کی بنا پر ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ جگر صاحب کے انتقال کے بعد یو۔پی گورنمنٹ نے انکی بیوہ کے لئے دو سو ماہوار کی اور حکومتِ ہند نے بھی دو سو روپیہ ماہوار کی حین حیات پنشن مقرر کر دی ہے۔

حکومت کے علاوہ عوام میں جو انکی خدمات کے اعتراف کا جذبہ پایا جاتا ہے اس سلسلہ میں سندیش جموں کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ جموں وکشمیر میں بھی یہ کوشش کیجا رہی ہے کہ انکے لواحقین کو محسوس نہ ہونے دیں کہ جگر اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں ادب نواز حضرات کی کمی نہیں۔ چنانچہ مشاعروں، ادبی اجتماعوں اور دیگر ذرائع کے ذریعہ حضرت جگر کے لواحقین کے لئے فنڈ جمع کئے جا رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ جلد ہی ایک رقم خطیر ریاست سے جگر کے لواحقین کو ارسال کی جائے گی۔"

میرا کلام

میری نظر میں

جگر مرادآبادی

جگرؔ نے 'شعلۂ طور' کے

پہلے ایڈیشن میں جو ۱۹۳۲ء میں نامی پریس لکھنؤ

سے شائع ہوا تھا اپنے کلام پر خود اپنے قلم سے اظہار

خیال کیا تھا وہ مضمون بطور یادگار اس تذکرہ

میں شامل کیا جا رہا ہے'

یہ میں فخریہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور کج مج واقع ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا۔

شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین لکھے جو میرے ذاتی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھے، افسوس کہ سب ضائع ہو گئے۔

اوّلاً تو میرے لئے لکھنا لکھانا ہی مصیبت سے کچھ کم نہیں۔ اس پر بار بار کی شدید جگر کاویوں کے نتائج کا اس آسانی سے محو ہو جانا خصوصاً میرے لئے کس قدر اندوہناک سانحہ ہو سکتا ہے۔

ارادہ تھا "شعلۂ طور" پر خود کوئی مقدمہ لکھوں چنانچہ کئی بار لکھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح ضائع ہی ہوتا چلا گیا۔ مشیّت الٰہی شاید مجھ سے یہ کام لینا نہیں چاہتی۔ یا کسی آنے والے وقت تک منتظر رکھنا چاہتی ہے۔ انشاء اللہ العزیز "شعلۂ طور" کی دوسری اشاعت میں اس کمی کو پورا کر دیا جائیگا۔

سرسری طور پر اپنے کلام کے متعلق کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔

"اغلاط" سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے پروا رکھا ہے اور نہ انھیں کا

ہو کر رہ گیا ہوں۔ اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں۔

اکثر ایسی بھی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے میں خوش ہوں گا اگر مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کر دیا جائے۔

(میرے نظریۂ شعری کے اعتبار پر) مشاعرے کی غزلوں میں سے بہت کم ایسی غزلیں ہو سکتی ہیں جن پر صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق کیا جا سکے۔ تاہم ہر جگہ آپ میری انفرادیت محسوس کئے بغیر نہیں گزر سکیں گے۔

میری شاعری "غزل" ہی تک محدود ہے اور چونکہ حسن و عشق میں میری زندگی ہے۔ اس لئے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

واقعۂ کانپور کے متعلق جو نظم ہے وہ بیشک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے لیکن اس میں ایک لفظ ایسا آ گیا ہے جس کے مفہوم کی محدودیت پر مجھے اکثر تأسف رہا۔ اور وہ لفظ "مادرِ وطن" ہے۔ میں وطنیت اور قومیت دونوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ ناظرین میں کسی کو اللہ اگر توفیق عطا فرمائے تو انھیں میری طرف سے قطعاً اجازت ہے کہ وہ اس کو صحیح کر دیں۔

اکثر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن احباب کے سخت اصرار پر۔ ممکن ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں اجزائے دل پائے جائیں۔ لیکن میرے لئے وہ سرمایۂ فخر

نہیں۔ اچھا ہوا کہ ضائع ہو گیا۔ البتہ دو نظمیں جن میں سے ایک نظم "تلک کی موت" پر ہے اور دوسری اسکول اسٹرائک کے موقع پر "بچوں سے خطاب"۔ ان دونوں کے تلف ہونے کا مجھے ضرور صدمہ ہے۔ لیکن تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تخیل کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ "مورخِ ادبی" میرے عقائد مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے۔ اس لئے یہ ظاہر کئے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی جبکہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی، اس لئے اس میں بیجا غلو اور بعض قسم کی لغزشیں ہو گئی ہیں میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے لیکن نہیں ہو سکی۔ اس لئے احتیاطاً اِس قدر لکھ دیا گیا ـ

اپنی خصوصیات شاعری کے متعلق فی الوقت کسی طویل مضمون نگاری کے لئے آمادہ نہیں۔ صرف کچھ کہنے کے لئے کچھ کہتا ہوں ـ

مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مُطابقت ہے۔ تضاد نہیں۔

نقالی اور استادانہ مشاقی میرے لئے ننگ رہی ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ ننگ سمجھتا رہوں گا۔

دوسری خصوصیت کی جانب بہت کم حضرات کی توجہ منعطف ہوئی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ میں نے (اوّل کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر) حسن کو

قصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل اور رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق ان کے حقیقی تاثرات و واردات کو تا امکان صحیح صحیح شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

محاکات کے اعتبار پر اکثر مقامات آپ کو ایسے ملیں گے کہ مصور کے تمام کمالات ان کی تصویر کشی میں بیکار محض ثابت ہوں گے۔

لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے آپ کو اکثر و بیشتر مستقل اضافات و اوّلیات ملیں گے جنھیں بخوفِ طوالت چھوڑتا ہوں۔ وقت نہیں کہ اس سے زیادہ کچھ لکھا جا سکے۔ ناظرین نکتہ رس خود ہی اندازہ فرمالیں گے۔

ممکن ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اپنی ہی جنبشِ قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن اگر از راہِ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً مان لینا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں۔ بشرطیکہ احتساب نفس کے ساتھ ہو میں نے جو کچھ لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اہمیں نفسیات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔

میری زندگی گوناگوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے پیہم مصائب و آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ لیکن میں منہ بنا بنا کر رونے بسورنے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خود میں نے کہا ہے ؎

جاں ہمہ غم ساختم، رقصم بہ عشق　　دل ہمہ خوں کردہ، خنداں میردم

بیشک جس طرح جذبات مسرت و انبساط فطری عطیات ہیں، اسی طرح جذباتِ غم والم بھی۔ لیکن سچے رونے والے کہاں ؟ الفاظ بیشک رونے والے صرف کئے جاتے ہیں لیکن دل ٹٹولیئے تو درد کا نام بھی نہیں۔

مشاقی کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے، یا جو چاہا اور جس طرح چاہا کہہ دیا۔ زندگی کو شعر سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر سچے رونے والے ہوں بھی تاہم اس قسم کا "شعر و ادب" اوّلاً تو حیات قومی کے لئے سمِّ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ دوئمش کامیاب رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و عمومیت پائی جاتی ہے۔

آپ میرے کلام میں بظاہر درد کا عنصر بہت کم پائیں گے۔ لیکن ذرا ٹھیر کر آپ اگر جذبات اور شعر کا جائزہ لیں گے تو ایک بہت ہی نازک سی موجِ درد ضرور محسوس کریں گے اور جس طرح میری زندگی تازہ بتازہ نو بنو انقلابات و تغیرات کے ماتحت تبدیل ہوتی گئی۔ بعینہٖ اسی طرح رنگِ کلام بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکا اور حافظہ نے مدد کی "شعلۂ طور" کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا۔ تاہم نظرِ ثانی کا محتاج رہ گیا۔ انشاءاللہ تعالیٰ دوسری اشاعت میں پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

"جگر" مرادآبادی

اردو اکیڈمی سندھ کراچی